سرگذشت غالب



از ڈاکٹر محی الدین قادری زور

سلسلہ مطبوعات ادارۂ ادبیاتِ اردو۔ شمارہ (۴۳) طبع دوم شمارہ

سرگذشتِ غالب

یعنی

اردو اور فارسی کے مشہور شاعر و ادیب

مرزا اسد اللہ خاں غالب نظام جنگ نجم الدولہ دبیر الملک

کی حیات، کارناموں، اور اعزہ و احباب کا ایک مجمل تذکرہ

از

ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور

ام اے۔ پی ایچ ڈی (لندن)۔ پروفیسر ادبیات اردو جامعہ عثمانیہ
پرنسپل دار العلوم کالج حیدرآباد

طبع دوم ۱۹۵۰ء

مطبوعۂ افضل برقی مشین پریس حیدرآباد

قیمت

فہرست

دیباچہ

(۱) غالب کے متعلق ادب

(صفحات ۱۱ تا ۱۷)

(۲) حیات غالب

(صفحات ۱۸ تا ۳۲)

(۳) غالب کے ادبی کارنامے

صفحات ۳۳ تا ۴۹

(۴) غالب کے اعزہ و احباب

(صفحات ۵۰ تا ۶۸)

دیباچہ

مرزا غالب ہی اُردو کے ایک ایسے شاعر اور ادیب ہیں جن کی حیات اور کلام پر بہت کچھ لکھا جا چکا اور لکھا جا رہا ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جتنا زیادہ لکھا جاتا ہے اتنا ہی ان کی شخصیت واضح ہونے کی جگہ پس پردہ ہوتی جا رہی ہے۔ ہر نئی کتاب یا مضمون میں ایک نئی تحقیق پیش کی جاتی ہے اور تحریر کا انداز اتنا محققانہ ہوتا ہے کہ غالب اور ان کا کلام تو ایک طرف رہجاتا ہے، لیکن مضمون نگار یا مصنف کا علم و فضل اور ذوق تحقیق روشنی میں آجاتا ہے۔

بعض ستم ظریف ایسے بھی ہیں جو مرزا کے نقائص پر زور دے کر شہرت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس گندہ طریقے سے ان کی نسبت اظہار خیال کرتے ہیں کہ سنجیدہ ذوق رکھنے والوں کو ناگوار گذرتا ہے۔ غرض مداحوں اور معترضوں کے اس باہمی

پیکار میں علم و ادب کے طلبہ اور صاحب ذوق مطالعہ کرنے والوں کے لئے بڑی دقتیں پیدا ہو رہی ہیں کیونکہ وہ غالب کے حالات زندگی، کلام کی نوعیت تصنیفات کی تفصیل، اور تاریخ وار واقعات سے قطعاً نابلد رہ جاتے ہیں۔

کوئی مدرسہ یا کالج ایسا نہ ہوگا جہاں اردو کی تعلیم ہوتی ہو اور مرزا غالب کا تھوڑا بہت کلام نہ پڑھایا جاتا ہو۔ کلام کے ساتھ طلبہ شاعر کے صحیح اور مکمل حالات معلوم کرنے کے بھی خواہشمند ہوتے ہیں لیکن جب غالب سے متعلق کسی مختصر اور مفید کتاب کی تلاش کی جاتی ہے تو مایوسی ہوتی ہے۔ جتنی کتابیں اس موضوع پر یادگارِ غالب کے بعد چھپی ہیں سب میں مصنفوں نے ذاتی تحقیق و تفتیش پر اتنا زور دیا کہ پڑھنے والا اسباب و دلائل اور حوالوں اور حاشیوں میں اُلجھ کر رہ جاتا ہے۔ اس لئے ایک ایسی چھوٹی کتاب کی ضرورت تھی جس میں غالب کی زندگی کے سلسلہ وار تاریخی حالات، ان کی شاعری اور انشاء پردازی کا ارتقا، کتابوں کی تیاری و اشاعت کی باترتیب تفصیل، اور ان کے خاص خاص اعزہ، احباب، اور تلامذہ کا تذکرہ اور تعلقات اجمال کے ساتھ درج ہوں۔ چنانچہ اس "سرگذشت" میں اس امر کی کوشش کی گئی ہے کہ جہاں تک ہو سکے ذاتی علم و فضل یا تحقیق و تفتیش کے ادعا یا اظہار کے بغیر کم سے

کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معلومات پیش کی جائیں تاکہ پڑھنے والے لکھنے والے سے زیادہ جس کی نسبت لکھا جا رہا ہے اس کے متعلق معلومات حاصل کر لیں۔

یہاں اس امر کا اظہار بھی ضروری ہے کہ یہ مختصر سی کتاب اصل میں مرزا غالب کے اردو ادب پاروں[ع] کے ساتھ مقدمہ کے طور پر لکھی گئی۔ لیکن یہ مقدمہ بجائے خود ایک ایسی چھوٹی سی کتاب بن گیا جو طلبہ اور ادب کا عام مطالعہ کرنے والوں کے لئے مفید ثابت ہوگا اس لئے اس کو علحدہ کتابی صورت میں بھی شائع کیا جا رہا ہے۔ اس میں غالب کی ایک تصویر کے علاوہ ان کے اور ان کے سرالی اعزہ کے شجرے بھی شامل ہیں جو پہلی دفعہ شائع ہو رہے ہیں اور جن کے مطالعہ سے بہت سی مفید باتیں بیک نظر معلوم ہوں گی۔

سید محی الدین قادری زور
رفعت منزل خیریت آباد

ع یہ ادب پارے "روح غالب" کے عنوان سے علحدہ کتابی صورت میں شائع ہوئے ہیں۔ روح غالب اصل میں مرزا غالب کے اردو خطوط کا نچوڑ ہے۔ اور اس کے مطالعہ سے غالب کی شخصیت اور قلبی و روحانی کیفیات صحیح معنوں میں بے نقاب ہو جاتی ہیں

مرزا غالب اردو کے ایک بلند پایہ شاعر اور بہت بڑے ادیب تھے
اردو ادب کی تاریخ میں کوئی اور شخصیت ایسی نظر سے نہیں گزرتی جو نظم و نثر
دونوں میں ایسا اعلیٰ مرتبہ رکھتی ہو۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ مرزا کی انشا
پردازی میں بھی وہی اجتہادی شان موجود ہے جو ان کی شاعری کی جان ہے۔
یہ اصل میں ان کی فطرت کا اقتضا تھا۔ وہ ہر وقت پرانی ڈگر سے ہٹ کر چلنا چاہتے
تھے۔ لکیر کا فقیر بننا ان سے ممکن نہ تھا۔ اسی ڈیڑھ اینٹ کی علیحدہ مسجد بنانے کے
خبط نے انھیں عمر بھر پریشان حال اور ایک حد تک ناشاد و نامراد رکھا۔ لوگ ان کو
مغرور و متمرد اور خودبین و خود رائے سمجھتے تھے۔ لیکن جو خصوصیتیں ان کی زندگی
میں ان کی خرابیاں سمجھی جاتی تھیں آج وہی ان کی خوبیاں ہیں!

مرزا غالب نے اردو شاعری میں نیا رنگ اختیار کیا تو لوگ انھیں
"بے استاد" کہنے لگے، اور ان کی شاعری کو ع "پہلے تو روغن گل بھینس کے
انڈے سے نکال" جیسی شاعری قرار دیا۔ مرزا نے برہان قاطع کی غلطیوں
کو وضاحت سے بیان کیا تو ان کے ہم عصر ان کے درشت لہجہ کو
برداشت نہ کر سکے کیونکہ وہ تقریظوں اور مدح سرائیوں کے عادی اور
تیز تر اسلوب تنقید سے ناواقف تھے۔ مرزا غالب نے مرزا قتیل اور

واقف کو سب کچھ سمجھنے سے انکار کر دیا تو ان کے بہت سے کرم فرما بگڑ گئے کیونکہ وہ "اعتقاد من بس است" کے قائل تھے اور مرزا غالب پیرا و جس میں فرق کرنا چاہتے تھے۔ غرض غالب کی زندگی انہی مجتہدانہ جراتوں میں بسر ہوئی اور ان کے معاصرین ان کی ہر جدت کو "ایجاد بندہ" سمجھتے رہے جس پر ہمیشہ گندہ ہونے کا فتویٰ ملتا رہا۔

لیکن ان کی جملہ قوتوں میں سے اگر کسی پر اعتراضوں اور غلط فہمیوں کی کم بوچھار ہوئی تو وہ ان کی اردو نثر تھی۔ حالانکہ یہ بھی ایک بالکل نئی چیز تھی۔ اور محض مرزا غالب کے جدت پسند قلب و دماغ کی پیداوار۔ کیونکہ ان سے قبل مقفیٰ اور مسجع عبارتوں کے لکھنے کا دور دورہ تھا اور کسی نے ایسی بے تکلفی اور آزادی کے ساتھ زبان کو قلمبند نہیں کیا تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کی نثر اس لئے ہدف ملامت بننے سے بچ رہی کہ ابتدا میں خاص خاص اصحاب ہی کو اس سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔ اور عوام کی یہاں اس وقت رسائی ہوئی جب غالب بہت بوڑھے ہو چکے تھے مقابلوں اور مخالفتوں کی آندھیاں ختم ہو چکی تھیں، اور ان کی قدر و منزلت کا آفتاب طلوع ہو رہا تھا۔ ان کے خطوط کا مجموعہ اس وقت شائع ہوا جب ان کی شمع زندگی جھلملا رہی تھی اور وہ تعریف و قدر افزائی سے یک گونہ بے نیاز ہو چکے تھے۔

یہ بھی فطرت کی عجیب ستم ظریفی ہے کہ اکثر اس وقت انسان کو شہرت اور عزت و مقبولیت نصیب ہوتی ہے جب وہ اس سے مستفید ہونے کے قابل نہیں رہتا، یا جب کہ اس کو اس کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔

غالب کے متعلق ادب

ابتدائی کوششیں

مرزا غالب کے متعلق اس وقت تک متعدد کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور آئندہ لکھی جائیں گی اور جیسے جیسے زمانہ گزرتا جائے گا ان کی شہرت اور عظمت میں اضافہ ہوتا جائے گا۔

حالی سب سے پہلے مولوی حالی نے ان کے اجمالی سوانح حیات اپنی مشہور کتاب "یادگار غالب" میں شایع کئے۔ یہ کتاب غالب کی پہلی حیات اور حالی جیسے ادیب کی تصنیف ہونے کی وجہ سے ہمیشہ اردو ادب کا شہکار سمجھی جائے گی۔ لیکن اس میں مصنف نے اپنے ماحول کے اقتضائے غالب کے کلام پر اتنا زور دیا ہے کہ ان کی زندگی کے حالات تشنہ رہ گئے۔

مولوی حالی کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ مرزا غالب کے قلب و دماغ کی خوبیوں اور خاص کر ان کے خداداد ملکہ شاعری کی خصوصیتوں سے اپنے ہم عصروں کو واقف کریں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب ہوئے۔ آج مرزا غالب کو جو اہمیت حاصل ہے اس کا ایک بڑا سبب مولوی حالی کی کوششیں بھی ہیں۔

آزاد حالی کے علاوہ آزاد نے بھی اسی دور میں "آب حیات" میں مرزا غالب

تذکرہ لکھا لیکن وہ اپنے اسلوب کی آرائش و زیبائش اور الفاظ کے بنانے اور سدھارنے میں اتنے منہمک رہتے تھے کہ اصل موضوع کی طرف زیادہ توجہ کرنے نہ پائے۔ وہ معنی سے زیادہ الفاظ و اسلوب پر زور دیتے تھے اور اسی وجہ سے ان کی کتاب میں تاریخی سقم باقی رہ گئے۔

غرض حالی اور آزاد نے غالب کے حالات زندگی اور ان کی شخصی یعنے قلبی و روحانی کیفیتوں کے بیان کو جس طرح تشنہ چھوڑ دیا وہ اسی طرح ناکمل رہا اور شاید ہمیشہ رہے۔ کیونکہ ان بزرگوں کو معلومات کے جو ذریعے حاصل تھے وہ ان کے دور کے ساتھ ختم ہو گئے۔ سانپ نکل گیا اور اب ان معلومات کو حاصل کرنے کی کوششیں لکیر پیٹتے رہنے سے زیادہ سودمند نہیں ہو سکتیں۔

چنانچہ اس خصوص میں بعض اصحاب نے بعد کو عجیب و غریب تحقیقیں کی ہیں اور مرزا کے کلام کے ذریعہ سے ان کو سیاسی مدبر، مصلح قوم، آزادی ہند کا علمبردار، انگریز گورنمنٹ کا خوشامدی اور جاسوس، غرض وہ سب کچھ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جو وہ قطعاً نہیں تھے۔ اس قسم کی کوششوں کو لکیر پیٹنا نہیں تو اور کیا کہا جاسکتا ہے؟

حیدر یار جنگ طباطبائی

حالی کی یادگار کے بعد یوں تو غالب کی شاعری کو سمجھنے اور سمجھانے کی بیسیوں کوششیں کی گئیں اور ہر شارح نے اپنی اپنی بساط کے مطابق مرزا کے اردو دیوان کی شرح لکھی لیکن مولانا علی حیدر نظم (حیدر یار جنگ) طباطبائی نے جو شرح دیوان غالب کی لکھی وہ اردو زبان میں اپنی قسم کی پہلی کوشش ہے۔ اس سے پہلے کسی اردو شاعر

کے کلام کا اس عالمانہ اور محققانہ شان کے ساتھ مطالعہ نہیں کیا گیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا نے اردو کی عزت بڑھادی۔ اور مرزا غالب کی شاعری کو وہ حقیقی عظمت بخشی جو حالی کی "یادگار غالب" کے بعد بھی نمایاں نہ ہو سکی تھی۔

دوسری شرحیں

مولانا طبا طبائی کی شرح کے بعد سے اب تک متعدد سخن گو اور سخن فہم اصحاب مثلاً بیخود دہلوی، آسی لکھنوی، نظامی بدایونی، حسرت موہانی، قاضی سید احمد، اور سہا وغیرہ نے دیوان غالب کی شرحیں لکھ کر شائع کیں، لیکن ان میں سے کسی کی شرح طبا طبائی کی "شرح دیوان غالب" کے پایہ کو نہ پہنچ سکی۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری

ان شرحوں کے علاوہ ضرورت تھی کہ غالب کی شاعری پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالی جاتی۔ اس کام کو بجنوری مرحوم نے انجام دیا۔ انھوں نے اس مشرقی شاعر کے محاسنِ کلام پر مغربی طرز کا ایک بسیط تبصرہ لکھا۔ یہ اصل میں قدیم وضع کی ایک طویل تقریظ ہے جو لکھنے والے کی وسعت معلومات اور یورپی طرز تحریر کی وجہ سے اردو میں اپنی قسم کی پہلی چیز نظر آتی ہے۔ اس میں اگرچہ جگہ جگہ مبالغہ سے کام لیا گیا ہے اور پوری تحریر بجائے خود ایک نثری شاعری بن گئی ہے لیکن اس کوشش نے غالب کے کلام کی مقبولیت میں خاطر خواہ اضافہ کیا اور مغربی تعلیم یافتہ اصحاب کو اس مشرقی شاعر کی طرف خاص طور پر متوجہ کر دیا۔

ڈاکٹر سید عبداللطیف

ان مغربی تعلیم یافتہ اصحاب میں ایک ڈاکٹر سید عبداللطیف بھی ہیں انہوں نے اپنی کتاب "غالب" مولانا

طباطبائی کے اسلوب میں لکھی ہے۔ یہ اصل میں بجنوری کے "محاسن کلام غالب" کا ردِ عمل ہے لیکن ڈاکٹر لطیف اپنے خاص نقطۂ نگاہ اور تنقیدی معلومات کی پیش کشی میں اتنے آگے بڑھ گئے کہ مرزا اور ان کا کلام بہت پیچھے رہ گیا۔ ان کے پیرایۂ بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شاعر کو پیش کرنے کی بجائے اعلیٰ نظریۂ تنقید کو پیش کر رہے ہیں۔ اور غالب سے واقف ہونے یا واقف کرانے کی جگہ اپنے معیارِ تنقید پر شاعر کے کارناموں کو اس طرح پرکھنا چاہتے ہیں کہ غالب کی شاعری نمایاں ہونے کی جگہ گھس پس کر رہ جاتی ہے۔

غالب کے متعلق ادب

سوانحعمریاں

غالب کے کلام کو سمجھنے کی کوششوں کے علاوہ گزشتہ چند سال کے عرصہ میں غالب کی تین سوانحعمریاں بھی شایع ہوئی ہیں۔ جن میں پہلی مولانا غلام رسول مہر بی۔ اے

غلام رسول مہر

مدیر روزنامہ انقلاب لاہور کی کتاب "غالب" ہے جو رائل سائز کے ۹۰۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں ۱۴ ابواب ہیں اور ہر باب ایک خاص موضوع کے لیے مختص ہے۔ آخری دو باب یعنے تقریباً ۶۰ صفحات مرزا کی تصانیف اور کلام وغیرہ سے بحث کرتے ہیں۔ مہر نے حیات کا حصہ زیادہ کر دیا اور کلام کے متعلق کم۔ اس کی ضرورت بھی تھی کیونکہ اس اثناء میں مرزا کا کلام کافی روشنی میں آ چکا تھا۔ اس کے علاوہ مہر نے حالی کی پیدا کردہ بعض غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے اپنی کتاب میں "یادگار غالب" کے مقابلہ میں مرزا کی حیات اور حالات کے متعلق زیادہ معلومات درج کی ہیں۔ یہ کتاب ۱۹۳۶ء میں شایع ہوئی۔

شیخ محمد اکرام

دوسری کتاب "غالب نامہ" ہے جس کے مصنف شیخ محمد اکرام ایم اے آئی سی ایس ہیں۔ یہ بھی ۱۹۳۶ء میں پہلی کتاب کے چند روز بعد شایع ہوئی۔ اس میں غالب کے واقعات زندگی کو زیادہ صحت اور تاریخی تسلسل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اکرام صاحب نے نہ صرف مولوی حالی کی بعض غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی بلکہ ڈاکٹر لطیف نے اپنی کتاب میں غالب پر

جو اعتراضات کیے تھے ان کے جواب بھی دیے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "غالب نامہ" محض ڈاکٹر لطیف کی کتاب کے جواب میں یا ان کی کتاب سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے۔

اکرام صاحب نے ڈاکٹر لطیف کی کتاب سے بہت فائدہ اٹھایا ہے اور جو کام موخر الذکر نے نامکمل چھوڑ دیا تھا (یعنی تاریخی ترتیب کلام غالب) اس کو اکرام صاحب نے مکمل کر کے غالب نامہ کے آخر میں تقریباً سوا تین سو صفحات میں شائع کیا ہے۔ اگرچہ انھوں نے ڈاکٹر لطیف کے پیش کردہ ادوار سے کچھ اختلاف کیا ہے اور اپنی طرف سے ترمیم کر کے نئے ادوار قائم کیے اور ان کے تحت مرزا کے کلام کو تقسیم کر کے شائع کیا ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ غالب کے کلام کی تاریخی ترتیب کا خیال سب سے پہلے ڈاکٹر لطیف ہی نے پیش کیا اور اگرچہ وہ اپنا مرتبہ دیوان اب تک شایع نہ کر سکے لیکن اس قسم کی مستحسن کوشش کا سہرا انہی کے سر ہے۔

مالک رام

تیسری کتاب "ذکر غالب" ہے جس کو مالک رام صاحب ایم اے نے لکھ کر مکتبہ جامعہ دہلی سے چند ماہ پیشتر شایع کیا ہے۔ یہ کتاب اگرچہ چھوٹی سائز کے صرف سو صفحات پر مشتمل ہے لیکن ایسی جامع و مانع ہے کہ آج تک اردو میں کوئی ایسے اچھے سوانح حیات نہیں لکھے گئے۔ "ذکر غالب" مغربی طرز کی سوانح عمریوں کا ایک خوبصورت اور مکمل نمونہ ہے اس میں افراط و تفریط بالکل نہیں۔ ہر مناسب اور ضروری معلومات اس میں شامل ہیں اور خاص بات یہ ہے کہ مالک رام صاحب نے جگہ جگہ اپنی ذاتی تحقیق و تفتیش کا اظہار بھی کیا ہے۔ غالب کے متعلق اتنی مختصر اور مفید کتاب شاید ہی لکھی جا سکے۔

غالب اور ان کے کارناموں کے متعلق ایک اور کتاب عرصہ سے زیر ترتیب ہے

مہیش پرشاد

جو ابھی تک شایع نہیں ہوئی۔ اس کو بنارس ہندو یونیورسٹی کے استاد اردو و فارسی مولوی مہیش پرشاد مرتب کر رہے ہیں اور ان کی بڑی کوشش یہ ہے کہ غالب کی جملہ تصنیفات و تالیفات و کلام کے صحیح سنین و تواریخ معلوم کریں۔ اور اسی تاریخی ترتیب کے ساتھ انھیں مرتب کیا جا رہا ہے۔ یہ بہت بڑا کام ہے اور یہی وجہ ہے کہ اب تک شایع نہ ہو سکا۔ مہیش پرشاد صاحب نے غالب کے غیر مطبوعہ خطوط کا بھی ایک بڑا ذخیرہ جمع کر لیا ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ مرزا کے جملہ خطوط کو تاریخ وار ترتیب کے ساتھ شایع کریں۔

حیاتِ غالب

مرزا غالب ایک تورانی گھرانے میں پیدا ہوئے جو تلاشِ معاش کی خاطر سمرقند سے ہندستان چلا آیا تھا۔ ان کے دادا پہلے لاہور میں نواب معین الملک کی اور پھر دہلی میں نواب ذوالفقار الدولہ کی سرکار میں ملازم رہے۔ ان کے والد مرزا عبداللہ بیگ خاں دلی میں پیدا ہوئے اور آگرہ میں خواجہ غلام حسین خاں کمیدان کی دختر عزت النسا بیگم سے شادی کی جن کے بطن سے

خاندان

مرزا ۸ رجب ۱۲۱۲ھ (مطابق ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء) میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔

مرزا کے والد نے پہلے حیدرآباد دکن کی اور بعد کو ریاست الور کی فوجی ملازمت کی اور الور ہی میں ایک گڑھی کے زمیندار سے مقابلہ کرتے ہوئے ۱۸۰۲ء میں ان کے گولی لگی اور وہیں مدفون ہوئے۔ مرزا کے چچا مرزا نصراللہ بیگ خاں مرہٹوں کی طرف سے اکبرآباد کے صوبہ دار اور آخر میں لارڈ لیک کے لشکر میں رسالدار تھے۔ انھوں نے اپنے مرحوم بھائی کے کمسن بچوں مرزا غالب اور مرزا یوسف کی پرورش اپنے ذمہ لی لیکن پانچ سال ہی میں ۱۸۰۶ء میں وہ بھی کسی معرکہ میں کام آئے۔ اس وقت مرزا غالب کی عمر نو برس سے کم تھی۔

تعلیم و تربیت

سرپرستوں کی وفات نے مرزا کو باضابطہ تعلیم و تربیت سے محروم رکھا اور وہ جلد لہو و لعب میں مبتلا ہو گئے۔ تاہم

زمانہ کے رسم و رواج کے مطابق آگرہ میں مولوی محمد معظم کے مکتب میں کتب متداولہ کی آگاہی حاصل کی اور بعد کو جب ۱۲۲۶ھ ۱۸۱۱ء میں ایک پارسی نو مسلم عبد الصمد ایران سے ہندوستان آئے تو مرزا نے دو برس تک انھیں اپنے یہاں ٹھیرایا اور ان کی صحبت میں فارسی زبان اور ادب کا بڑا اچھا ذوق پیدا کیا اس سے قبل ہی وہ شعر گوئی شروع کر چکے تھے اور مرزا بیدل کے رنگ میں مشق سخن کرتے تھے۔

شادی اور سکونت دہلی

چچا کے تعلق کی وجہ سے وہ یوں تو بچپن ہی سے دلی آیا جایا کرتے تھے لیکن ۷ رجب ۱۲۲۵ھ (مطابق ۹ اگست ۱۸۱۰ء) کو ان کی چچانی نے اپنی بھتیجی امراؤ بیگم دختر مرزا الٰہی بخش خاں معروف سے شادی کرادی اس کے دو سال بعد مرزا نے دہلی میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

صحبت کا اثر

دلی میں مرزا کو سسرال کی وجہ سے بڑی اچھی اور شریف صحبتیں نصیب ہوئیں خود ان کے خسر نواب الٰہی بخش خاں معروف ایک کہنہ مشق اور قادر الکلام شاعر ہونے کے علاوہ صاحب حال و قال فقیر اور صوفی بھی تھے۔ اور معروف کے بڑے بھائی نواب فخر الدولہ دلاور الملک احمد بخش خاں رستم جنگ والیٔ لوہارو اور دہلی کے خاص امرا و عمائدین سے تھے جن کے ایک فرزند نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر و رخشاں بڑے عالم و فاضل شاعر اور مورخ تھے۔ غرض غالب کو عنفوان شباب میں اچھی سنجیدہ اور لائق صحبتیں ملیں اور خاص کر اپنے خسر کی وجہ سے تو وہ تصوف و عرفان سے بھی کما حقہٗ واقف ہو گئے۔ چنانچہ ان کے کلام میں "مسائل تصوف" کا جو بیان ہے وہ حضرت معروف ہی کا

فیضان ہے اور بہت ممکن تھا کہ ان بزرگ کے اثر سے وہ ولی بھی سمجھے جا سکتے اگر بادہ خوار نہ ہوتے۔

الٰہی بخش خاں کے علاوہ مولوی فضل حق خیرآبادی جیسی سخن فہم اور پاکیزہ ذوق ہستی سے بھی غالب نے اس زمانہ میں بہت کچھ حاصل کیا اور ان لفظی و معنوی تعقیدوں سے پرہیز کرنے لگے جو ان کے ابتدائی کلام میں بیدل کی تقلید کا نتیجہ تھا۔ اگر مولوی فضل حق سے ملاقات نہ ہو جاتی تو شاید میر تقی میر کی پیشین گوئی کی دوسری شق پوری ہوتی جس میں انھوں نے کہا تھا کہ یہ لڑکا بھٹک جائے گا۔ طرز کلام کی تبدیلی کے علاوہ اس شائستہ صحبت نے مرزا کے اخلاق و عادات پر بھی اچھا اثر کیا اور وہ لہو و لعب اور رندی و بدمستی ایک حد تک کم ہو گئی جو آگرہ سے آتے وقت ان کی طبیعت ثانی بن گئی تھی۔

مالی پریشانیاں

اس صحبت صالح کے علاوہ مرزا کے اخلاق کی درستی میں ان کی مالی پریشانیوں کا بھی حصہ ہے۔ مرزا غالب نصراللہ بیگ خاں کے وارثوں میں ہونے کی وجہ سے ان کی جاگیرات سے حصہ پاتے تھے۔ یہ جاگیریں ان کے چچا کے انتقال پر نواب احمد بخش خاں کے علاقہ میں شامل ہو گئی تھیں۔ لیکن جب سنہ ۱۸۲۲ء میں نواب گوشہ نشین ہو گئے اور اپنی جاگیروں کو اپنی اولاد میں تقسیم کر دیا تو مرزا غالب کے حصہ کی تقسیم شمس الدین احمد خاں رئیس فیروز پور کے تفویض ہو گئی۔ موخرالذکر کو ان کے اعزہ کچھ اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے کیونکہ ان کی والدہ شریف الخاندان نہ تھی۔ مرزا غالب یوں تو پہلے سے ہی ان کے مخالفین میں تھے لیکن اب ان کے برتاؤ اور

وقت پر حصہ نہ دینے کی وجہ سے مخالفت بڑھ گئی۔ چنانچہ ان کے خلاف کلکتہ میں مقدمہ دائر کرنے کے لئے اگست ۱۸۲۶ء میں دلی سے نکلے۔ راستہ میں گیارہ ماہ کے قریب لکھنؤ میں قیام کیا اور آخر کار ۱۴ شعبان ۱۲۴۲ھ (م ۱۹ فروری ۱۸۲۸ء) کو کلکتہ پہنچے۔

کلکتہ میں

اس سفر سے اگرچہ غالب کو معاشی فائدہ نہ ہوا اور وہ اپنے اصل مقصد میں ناکام رہے یعنی فیصلہ ان کے خلاف ہوا لیکن تین سال تین ماہ کے اس سفر میں انھوں نے بہت سے سبق سیکھے۔ خود کلکتہ میں مرزا کا ایک سال نو ماہ تک قیام رہا اور وہاں کی فضا انھیں اتنی پسند آئی کہ انھوں نے ایک خط میں لکھا، اگر میں متاہل نہ ہوتا اور خانہ داری کی ذمہ داریاں راہ میں حائل نہ ہوتیں تو مدت العمر کلکتہ میں ہی رہ جاتا۔

کلکتہ اس وقت ہندستان کا پایہ تخت تھا۔ بازاروں کی چہل پہل یوروپین عورتوں کی بے پردگی اور رنگا رنگ شراب کی ارزانی اور کثرت، ایک رند مشرب شاعر مزاج کے لئے جنت ارضی سے کم نہیں۔ یہی وہ خصوصیات تھیں جنھوں نے غالب کے ایک پیشرو شاعر ولی اورنگ آبادی کو بندرگاہ سورت کا شیدا بنا دیا تھا۔ اس وقت سورت کا وہی عالم تھا جو عہد غالب میں کلکتہ کا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں ولی نے سورت کے لئے:۔

اہے مشہور اس کا نام سورت	کہ جا دے جس کے دیکھے سب کدورت
شہر جوں منتخب دیوان ہے سب	ملاحت کی وہ گویا کھان ہے سب

لکھا، غالب نے کلکتہ کے متعلق لکھا ہے ؎

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں — اک تیر میرے سینہ پہ مارا کہ ہائے ہائے
وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب — وہ نازنیں بتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے
صبر آزما وہ ان کی نگاہیں کہ حف نظر — طاقت ربا وہ ان کا اشارا کہ ہائے ہائے
وہ میوہ ہائے تازہ و شیریں کہ واہ واہ — وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ مرزا کا سارا وقت کلکتہ میں عیش و آرام ہی میں گزرا۔ ان کے دوران قیام میں وہاں ایک دلچسپ ادبی ہنگامہ بھی برپا ہوا جس نے غالب کو بڑا پریشان کر دیا۔ یہ ہنگامہ محض مرزا کی مجتہدانہ شان اور طبیعت کی آزادہ روی کی وجہ سے پیدا ہوا۔ انھوں نے ایک خاص مشاعرہ میں جو ان کے اعزاز میں منعقد ہوا تھا قتیل اور واقف کو ہندستانی فارسی داں کہہ کر ان کی سند قبول کرنے سے انکار کر دیا اور قتیل کے متعلق (جن کی لیاقت، سخنوری، اور زباں دانی کا سکہ اس عہد کے جملہ فارسی ادب کے ذوق رکھنے والوں پر بیٹھا ہوا تھا) مرزا نے یہاں تک کہہ دیا "وہ فرید آباد کا کھتری بچہ؟ میں کیوں اس فرومایہ کو سند ماننے لگا"۔ یہ غیر شائستہ جملے اور خاص کر قتیل کے معتقدوں کے سامنے بالکل بے محل تھے۔ ان کی وجہ سے رنگ میں بھنگ پڑ گیا اور مرزا کے قیام کلکتہ کا زمانہ ذہنی پریشانیوں اور ادبی مقابلوں میں گزرا۔ آخر کار انھوں نے ایک فارسی مثنوی "باد مخالف" لکھی جس میں ایک حد تک معذرت اور کچھ ہجو ملیح سے کام لیا۔

کلکتہ کے قیام نے مرزا کو جگہ جگہ کے لوگوں سے ملنے کا اور خاص کر یورپی تہذیب و تمدن سے واقف ہونے کا موقع دیا۔ ان کی نظر نہ صرف زندگی

بلکہ زبان و ادب کے مسائل میں بھی وسیع ہو گئی۔ وہ اگرچہ بہ ظاہر اپنی روش پر قائم رہے اور ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانا ان کی فطرت کا اقتضا تھا تاہم ۲۸ نومبر ۱۸۲۹ء کو جب وہ دلّی واپس ہوئے تو ان کے کلام اور طبیعت پر اس میل جول، ان ہنگاموں اور مقدمہ میں ناکامی کا ضرور اثر نمودار ہوا۔ ان میں اب وہ مشیخت اور جوانی کی ترنگ باقی نہ رہی تھی۔

بدنامی

دلّی میں بھی غالبؔ کو اب پہلے کی طرح چین نصیب نہ ہو سکتا تھا۔ ہار کے بعد شمس الدین احمد خاں سے ان کی مخالفت اور بڑھ گئی اور چونکہ ریزیڈنٹ ولیم فریزر ان کا گہرا دوست تھا جب وہ ۲۲ مارچ ۱۸۳۵ء کو شام کے وقت گولی سے مارا گیا تو اس کے قاتلوں کی تلاش میں نواب شمس الدین خاں کے آدمیوں کا پتہ چلا۔ اس وقت غالبؔ پر کسی دیوانی مقدمہ میں ڈگری ہو چکی تھی اور وہ گرفتاری کے ڈر سے رات کے وقت چھپ کر نکلا کرتے تھے اور اسی طرح شہر کے مجسٹریٹ کے یہاں بھی جاتے تھے جو ان کے ملنے والوں میں سے تھے۔ اس واقعہ اور شمس الدین احمد خاں کی مخالفت اور فریزر کی دوستی اور آخر میں شمس الدین احمد خاں کا ۸ اکتوبر ۱۸۳۵ء کی صبح میں پھانسی پانا، ان سب باتوں کی وجہ سے لوگ غالبؔ پر جاسوسی کا شبہ کرنے لگے تھے۔ اور چونکہ اہل دہلی ایک مسلمان رئیس کی اس ذلت کے ساتھ موت سے بہت رنجیدہ تھے انھوں نے اس کا ایک سبب غالبؔ کو بھی سمجھ لیا اور ان کو بری نظر سے دیکھنے لگے۔ غالبؔ کی زندگی میں ان کی غیر مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔

شمس الدین احمد خاں کی وفات اور ان کی ریاست فیروز پور جھرکہ کی ضبطی کے بعد مرزا غالب کی پنشن دہلی کلکٹری سے ملنے لگی لیکن اس میں اضافہ نہ ہو سکا اور مرزا ہر طرح کی کوشش کے بعد مایوس ہو کر خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔

قید

مرزا کو بچپن سے شطرنج اور چوسر کھیلنے کی عادت تھی اور شغل کے طور پر کچھ بازی بد کر کھیلتے تھے اور یہ خلاف قانون تھا اس لئے جولن ۱۸۴۷ء میں قمار بازی کے الزام میں گرفتار کر لئے گئے اور چھ ماہ قید بامشقت اور دو سو روپیہ جرمانہ کی سزا کا فیصلہ سنا۔ لیکن پورے چھ ماہ قید میں نہ رہے۔ تین ماہ کے بعد مجسٹریٹ کی سفارش پر رہا کر دئے گئے۔

اس واقعہ کے متعلق محسن بن شبیر صاحب بی۔ اے ال ال بی نے ایک مختصر سی کتاب "یوسف ہندی قید فرنگ میں" لکھی ہے جو ادارہ ادبیات اردو کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ اس میں غالب کا ترکیب بند اسیری بھی مکمل درج ہے جو انھوں نے قید خانہ میں لکھا تھا اور جس کے ایک ایک لفظ سے غم و غصہ کا اظہار ہوتا ہے۔

قلعہ کی ملازمت

چونکہ مرزا غالب انگریزوں کے پنشن خوار تھے اور اس سلسلہ میں انگریز عہدہ داروں سے انھیں تعلقات رکھنے پڑے تھے اس لئے قلعہ سے ان کا تعلق نہ ہو سکا۔ لیکن جب انگریزوں نے بادشاہ پر زور ڈال کر اپنے آدمی حکیم احسن اللہ خاں کو مدار المہامی کی خدمت پہ مامور کرا دیا تو انگریزوں کے دوسرے بہی خواہوں کو بھی دربارِ مغلیہ میں بار پانے کا موقع مل گیا۔ اور مرزا غالب بھی وزیر کی عنایت سے ۴ جولائی

۱۸۵۰ء کو بہادر شاہ کے حضور میں پیش ہوئے۔ نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ کے خطاب اور پچاس روپیہ ماہوار سے سرفراز کیئے گئے۔ اور یہ ملازمت اور اعزاز بھی شاعری کی حیثیت سے نہیں ملا۔ لیکن کچھ نہ کچھ کام ان کے تفویض کرنا ضروری تھا اس لیئے وزیر نے تاریخ تیموریہ لکھنے کا کام ان کے سپرد کیا۔ غالب کو تاریخ سے کوئی دلچسپی نہ تھی لیکن وزیر ان کو پورا مواد جمع کر دیتے تھے اور یہ اس کو اپنی طرز خاص میں قلمبند کر دیتے تھے۔ نظم کی طرح نثر میں بھی مرزا جدتیں اور خاص رنگ پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ ان کی تاریخ "پرتوستان" کا ایک بالکل نیا اسلوب ہے۔ اس کتاب کو انھوں نے دو حصوں پر منقسیم کر دیا تھا۔ ایک مہر نیمروز دوسرا ماہ نیم ماہ لیکن صرف پہلا حصہ تکمیل کو پہنچا۔ دوسرا نام ہی نام ہے۔ کام کا آغاز بھی نہ کرنے پائے تھے کہ غدر ہو گیا۔

عروج و زوال ۱۶ نومبر ۱۸۵۴ء کو جب شیخ ابراہیم ذوق کا انتقال ہو گیا تو بادشاہ نے اپنا کلام مرزا کو دکھانا شروع کیا۔ بادشاہ کے علاوہ ولیعہد اور دیگر شہزادے بھی غالب کے شاگرد ہوئے۔ اب جو مرزا کی قدر و منزلت اور مالی حالت بھی اچھی ہونے لگی تھی کہ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو غدر کا آغاز ہوا اور مرزا خانہ نشیں ہو گئے۔ اس تنہائی اور پریشانی کے عالم میں انھوں نے کتاب "دستنبو" میں غدر کے حالات لکھنے شروع کیئے اور ایک فارسی لغت "برہان قاطع" کی غلطیاں قلمبند کیں۔ اسی اثنا میں ان کے بھائی مرزا یوسف نے ۱۸ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو انتقال کیا تھا

جوانی ہی میں دیوانے ہو گئے تھے اور مرزا کے لئے ان کا وجود و عدم برابر تھا۔
غدر کے ساتھ ہی مرزا کی پنشن اور قلعہ کی تنخواہ بند ہو گئی۔ ان کی بیوی کے زیورات
اور قیمتی کپڑے جو میاں کالے کے مکان میں حفاظت کے لئے بھیج دیئے گئے
تھے لٹ گئے۔ مسلمان اعزہ و اقارب سب پریشان تھے کہیں سے کوئی مدد
نہ مل سکتی تھی۔ البتہ ان کے ہندو احباب مہیش داس، ہر گوپال تفتہ
اور منشی ہیرا سنگھ وغیرہ نے حتی الوسع ان کی مدد کی۔

رامپور سے تعلق

غدر سے چند ماہ قبل ہی سے مرزا کا تعلق رامپور
سے ہو گیا تھا اور نواب یوسف علی خاں جو
بچپن میں قیام دہلی کے زمانہ میں مرزا سے فارسی پڑھ چکے تھے اب ان
سے اصلاح سخن لینے لگے تھے اور کبھی کبھی کچھ رقم بھی بھیج دیا کرتے تھے۔
لیکن مسلسل تین سال یعنی مئی سنہ ۱۸۶۰ء تک ان کی انگریزی پنشن بند رہی۔
اور وہ گھر کے برتن اور کپڑے تک بیچ کر کھاتے رہے۔ آخر کار وہ گھر بار چھوڑ کر
کسی طرف نکل جانا چاہتے تھے کہ ۱۶ر جولائی سنہ ۱۸۵۹ء سے نواب رامپور نے
سو روپیہ ماہوار تنخواہ ان کے نام جاری کر دی جو ان کی وفات تک ملتی رہی۔

انگریزوں کی خفگی

غالب جو انگریزوں کے موروثی پنشن خوار تھے عمر بھر
انگریزوں کی مدح سرائی اور خیر سگالی کرتے
رہے لیکن غدر کے زمانہ میں انگریزوں کو ہندوستانیوں سے ایسا تلخ تجربہ
ہوا کہ وہ اپنے اچھے سے اچھے ہی خواہوں پر شبہ کرنے لگے تھے چنانچہ مرزا
پر بھی کئی الزامات لگائے گئے جن میں اہم الزام یہ تھا کہ انھوں نے

۱۸؍جولائی ۱۸۵۷ء کے دربار شاہی میں بہادر شاہ کے نام کا سکہ لکھ کر پیش کیا تھا۔ جب حکومت کی اس بدظنی کو دور کرنے کی تمام تدبیریں ناکام ہوئیں تو مرزا نے دربار رام پور کے ذریعہ سے اپنی صفائی کی ترکیب سوچی اور یوں بھی نواب نے رامپور آنے کی تین بار دعوت دی تھی اس لئے ۱۹؍جنوری ۱۸۶۰ء کو دہلی سے نکل کر ۲۷؍جنوری کو رام پور پہنچے اور قریب تین مہینے قیام کر کے ۱۷؍مارچ کو رامپور سے نکلے اور ۲۴؍مارچ کو دہلی واپس آگئے۔ اسی مہینے سے ان کی پنشن پھر جاری ہوگئی اور ان کا سفر رامپور ہر طرح کامیاب رہا۔ پنشن کے علاوہ تین سال بعد مارچ ۱۸۶۳ء سے دربار و خلعت کا اعزاز بھی بحال ہوگیا۔

رامپور کا دوسرا سفر

جب ۲۱؍اپریل ۱۸۶۵ء کو یوسف علی خاں کا انتقال ہوگیا اور ان کے فرزند کلب علی خاں جانشین ہوئے تو تہنیت کے لئے مرزا غالب نے رامپور کا سفر کیا۔ اس دوسرے سفر میں صرف دو ماہ قیام رہا یعنی ۱۲؍اکتوبر ۱۸۶۵ء کو رامپور پہنچے اور ۲۸؍ڈسمبر کو دہلی کی طرف کوچ کیا۔ راستہ میں دریائے رام گڑھ کی طغیانی اور پل بہہ جانے کی وجہ سے ان کو بڑی پریشانی لاحق ہوئی۔ اور یہ ڈسمبر کی سردی اور بارش کی وجہ سے بیمار ہوگئے۔

وفات

اس حادثہ کی وجہ سے ان کی کمزوری میں اضافہ ہوگیا اور طرح طرح کی بیماریوں نے گھیر لیا۔ آخر کار عرصہ تک علیل رہنے کے بعد ۱۵؍فروری ۱۸۶۹ء کو پیر کے دن آٹھ بجے صبح انتقال کیا اور سلطان جی

میں اپنے سسرالی خاندان لوہارو کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔

اخلاق و عادات

غالب کی زندگی کے واقعات پر ایک اجمالی نظر ڈالنے کے بعد ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اخلاق و عادات کے بارے میں بھی کچھ لکھا جائے تاکہ ان کی زندگی کا یہ پہلو تشنہ نہ رہ جائے۔

مرزا غالب کے سوانح حیات، ان کی تصنیفات اور خاص کر ان کے خطوط کے مطالعہ سے ان کی نسبت بعض بدگمانیاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ مولوی حالی نے "یادگار غالب" میں ان کے معائب کی مدافعت کی جگہ جگہ ناکام سی کوشش کی ہے۔ لیکن یہ ایک ایسا پہلو ہے جو کسی نہ کسی طرح بے نقاب ہو کر سامنے آجاتا ہے اور اس قسم کی باتوں کی پردہ پوشی کرنا انسان کو فرشتہ ثابت کرنا ہے۔ اس لئے مناسب تو یہ ہے کہ ان اسباب و علل اور نفسیاتی واقعات کو پیش کر دیا جائے جنھوں نے غالب کی طبیعت اور اخلاق و عادات کی تعمیر میں بڑا حصہ لیا ہے۔

مرزا غالب کی آزادہ روی، رندمشربی، اسراف اور اس کی وجہ سے ہمیشہ قرضہ میں مبتلا رہنا ایسے واقعات ہیں جو اس زمانہ کے امیرزادوں کی طرز معاشرت کے لازمی نتیجے تھے۔ مرزا ایک متمول اور خوشحال گھر میں پیدا ہوئے تھے، کوئی سرپرست اور نگران نہ تھا۔ ان کے ننھیال کی شہر آگرہ میں کافی املاک اور بڑی بڑی ڈیوڑھیاں تھیں جن میں وہ پتنگ اڑاتے شطرنج اور چوسر کھیلتے اور طرح طرح کے لہو و لعب میں مشغول رہتے تھے اور بہت ممکن ہے کہ رندمشربی اور شاہدبازی کا چسکہ بھی وہیں لگا ہو۔ بعد کو جو مرزا قمار بازی کے جرم میں گرفتار

ہو کر قید ہوئے وہ بچپن اور عنفوان شباب کی انہی رنگ رلیوں کا ثمرہ تھا۔
اس کو محض اتفاق سمجھئے یا دہلی میں آمد اور الٰہی بخش خاں معروف
کے خاندان میں نسبت ہونے کا نتیجہ کہ انھوں نے رفتہ رفتہ بہت سی خراب
عادتوں کو ترک کر دیا اور صرف شعر گوئی اور رندمشربی کو آخر عمر تک جاری رکھا۔
اور اس میں بھی ہمیشہ اعتدال سے کام لیا جسکی وجہ سے وہ عمر طبعی تک پہنچ سکے۔
ان کی بیوی نہایت متقی اور عبادت گزار تھیں اور انھوں نے اپنے خاوند
کی شراب نوشی کو موقوف کرنے کی حتی الامکان کوشش کی ہوگی لیکن جب
دیکھا کہ اس کافر کا چھٹنا مشکل ہے تو خود اپنا کھانا پینا برتن علیحدہ کر لئے۔ ان کے
خسر نواب معروف نے بھی مرزا کو اچھے کاموں میں مصروف رکھنے کی ممکنہ
سعی کی اور اپنے مریدوں کے لئے شجرۂ خلافت و سلسلۂ بیعت نقل کرنے کا کام
ان کے سپرد کر کے دیکھ لیا کہ مرزا نے کس خوبی سے ایک ایک نام درمیان میں
چھوڑ کر شجرہ نقل کیا اور کام سے بچ گئے۔ ان شوخیوں اور بے پروائیوں
کے باوجود دلی کے قیام اور وہاں کی صحبتوں کا مرزا پر اثر پڑنا ضروری تھا۔
چنانچہ وہ رفتہ رفتہ ایک خوش ذوق شاعر و ادیب اور ظریف الطبع امیرزادہ
کی حیثیت سے شائستہ اور اہل ذوق اصحاب کی محفلوں میں بار پانے لگے۔
اس کے بعد جب پنشن کے جھگڑوں نے پریشان کر دیا اور ساتھ ہی کلکتہ
میں علمی و ادبی مقابلے اور مباحثے ہوئے تو مرزا کی جوانی کی ترنگیں اور بچپن
کی آزادہ روی پھر عود کر آئی۔ وہ درشت لہجے بے باک تقریر و تحریر اور تیز
مزاجی سے کام لینے لگے جس کی وجہ سے ان کی مخالفتوں میں اضافہ ہونے لگا۔

اور مخالفین کے ساتھ ساتھ مرزا کی ذہنی تکلیفیں اور تیز مزاجی بھی ترقی کرتی گئی۔ چنانچہ اس کے بعد جب انھوں نے برہان قاطع پر تنقید لکھی تو اس کا اسلوب اتنا درشت ہو گیا اور بعض عبارتیں ایسی تلخ لکھیں کہ قدامت پسند طبیعتوں کو ناگوار گزرا اور انھوں نے ان کو غیر شائستہ قرار دیکر مرزا پر سب و شتم شروع کیا اور بعض مخالفین نے ان کے جواب میں گالی گلوج سے بھی کام لیا جن کی وجہ سے مرزا بڑے چراغ پا ہوئے اور تنگ آ کر اپنے مخالفین پر ازالۂ حیثیت عرفی کا دعویٰ بھی دائر کر دیا۔ مگر اس میں بھی ناکامی ہوئی جو ان کی ترش روئی اور تند مزاجی میں اور بھی اضافہ کا باعث تھی۔

ان علمی و ادبی اور عدالتی مخالفتوں کے علاوہ افلاس و عسرت نے بھی مرزا کو ہمیشہ پریشان حال اور مضطرب رکھا۔ ان کو بچپن سے اسراف اور قرض لینے کی عادت سی ہو گئی تھی جس کی بنا پر وہ اپنے گھر کا پورا اثاثہ یہاں تک کہ بیوی کے قیمتی کپڑے اور زیور بھی بیچ کر کھانے پر مجبور ہو گئے تھے لیکن اس سلسلہ میں سب سے زیادہ پریشان کن بات ان کی پنشن کی مسدودی تھی جس میں اضافہ کی خاطر وہ اپنی جوانی کے بہترین ایام مقدمہ بازی اور کچہریوں میں صرف کر چکے تھے اور جس کے غدر کے بعد سے بند ہو جانے کی وجہ سے ضعیف العمری میں مرزا کو سعی سفارش اور خوشامد بلکہ دریوزہ گری تک کے لئے مجبور ہو جانا پڑا۔

مرزا کی طبعی خودداری، آزادہ روی، اور رند مزاجی کے باوجود ان کے کلام میں امیروں اور عہدہ داروں کی جو مدح سرائی اور ان کے بعض خطوط میں جو سوقیانہ خوشامد، حرص و ہوس اور حسن طلب نظر سے گزرتا ہے اس کا

اصل سبب ان کی یہی غیر معمولی عسرت اور ضرورت سے زیادہ اخراجات تھے،
اگر ان کی پنشن غدر کے زمانہ میں بند نہ ہوجاتی تو مرزا کی شاعری اور خطوط کا
آج اور ہی ڈھنگ ہوتا۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی پراگندہ روزی نے ان کو ہمیشہ پراگندہ
دل رکھا اور ان کو ان کی طبیعت کے خلاف نوابوں اور انگریز عہدہ داروں کی بھٹئی
کرنے پر مجبور کردیا۔ اگر ان کے خطوط اور ذخیرۂ کلام میں توقع سے زیادہ مدح سرائی
کا حصہ شامل نہ ہوتا تو آج غالب کی شخصیت کچھ اور ہی نظر آتی۔

ان مصائب کے باوجود جو زیادہ تر مجبوریوں کا نتیجہ تھے مرزا کی طبیعت میں
ایسی خوبیاں بھی موجود تھیں جو ان کے جیسے بڑے آدمیوں میں ہونی ضروری
تھیں۔ ان میں مروت اور فراخ حوصلگی حد سے زیادہ پائی جاتی تھی، اور اس
کی وجہ سے انھیں تکلیفیں بھی اٹھانی ہوتیں مگر وہ طبیعت سے مجبور تھے اور اکثر
ہر ایک کے ساتھ سلوک کرنے کی طرف مائل رہتے خواہ ان کے یہاں کچھ ہو یا نہ ہو۔

مذہبی رواداری ان کے صوفیانہ عقائد کا نتیجہ تھی اس کے علاوہ ہندو
مسلمان اور سنی و شیعہ، ہر مذہب و ملت کے احباب اور تلامذہ اس کثرت سے
ان کے یہاں آتے جاتے رہتے تھے کہ ان کے لئے ایک دوسرے میں امتیاز کرنا
دشوار تھا۔ چونکہ خود عمر بھر کسی مذہب کے مطابق کوئی عبادت نہیں کی اور نہ
کوئی مذہبی عصبیت تھی اس لئے ہر مذہب والا ان سے بے تکلف ملتا اور
اپنے مطلب کی بات لکھا لیتا۔ چنانچہ انھوں نے مولوی فضل حق خیرآبادی
کی خاطر وہابیوں کے خلاف لکھ دیا اور حکیم احسن اللہ خاں کی خاطر شیعوں
کے خلاف۔ اور جب کسی نے کچھ پوچھا تو صاف کہہ دیا کہ مطلب ان کا ہے

الفاظ میرے۔ میں نے حکم کی تعمیل کی ہے۔ انھوں نے اس شعر میں اپنے کیش کا بالکل سچا اعتراف کیا ہے کہ ؎

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم — ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

مذہب سے اس بے تعلقی اور بے پروائی کے علاوہ اتنا ضرور ہے کہ وہ وحدۃ الوجود اور حبِ اہل بیت نبی کا اپنی تحریروں اور تقریروں میں اکثر تذکرہ کیا کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب ان کا انتقال ہوا تو ان کے بعض احباب نے شیعہ طریقہ پر ان کے جنازہ کی نماز پڑھنی چاہی لیکن ان کے برادرِ نسبتی اور عزیز دوست نواب ضیاء الدین احمد خاں نے سنّی طریقہ پر تجہیز و تکفین کرنے پر زور دیا۔

فراخ حوصلگی اور مذہبی رواداری کے علاوہ جو چیز ان کے اخلاق و عادات کا سب سے بڑا جزو تھی وہ ان کی ظرافت ہے۔ مولوی حالی نے متعدد لطیفے لکھنے کے بعد بالکل سچ لکھا ہے کہ ان کو "حیوانِ ناطق کی جگہ حیوانِ ظریف کہنا زیادہ مناسب ہے۔" وہ بات میں بات پیدا کرنے اور زندگی اور اس کے مرحلوں کو شگفتہ اور مزاحیہ نقطۂ نظر سے دیکھنے کے عادی سے ہو گئے تھے۔ ہنسنا اور ہنسانا اور اپنے دوستوں اور عزیزوں کو اپنی گفتگو یا خطوط کے ذریعہ سے خوش کرنا ان کا ایک خوشگوار مشغلہ بن گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ لوگ ان سے ملنے یا ان کا خط دیکھنے کے متمنی رہتے تھے۔ ان کی طبیعت کی یہ شوخی و ظرافت ان کے عہدِ طفولیت کی رنگ رلیوں اور آزادہ روِیوں سے پیدا ہوئی تھی لیکن تعجب ہے کہ زندگی کے بکھیڑوں اور معاش کے جھگڑوں کے باوجود باقی رہی اور آخر عمر میں تو اس میں اور بھی اضافہ ہو گیا تھا اور مرزا بجائے خود ایک انجمن بن گئے تھے۔

غالب کے ادبی کارنامے

فارسی نظم

مرزا نے بچپن سے فارسی میں بھی شعر کہنا شروع کر دیا تھا اور آخر وقت تک تقریباً گیارہ ہزار شعر لکھے۔ جن میں ساڑھے چار ہزار شعر صنف غزل میں اور دو ہزار سے زیادہ صنفِ مثنوی میں ہیں۔ باقی قصائد و قطعات اور ترکیب بند و ترجیع بند ہیں۔ انھوں نے کل تینتیس ۳۳ فارسی قصیدے لکھے جن میں بارہ حمد و نعت و منقبت و مدح ائمہ میں اور باقی بائیس اکیس قصائد شاہانِ دہلی و اودھ نوابانِ رامپور، اور انگریز عہدہ داروں اور اپنے دوستوں اور محسنوں کی تعریف میں ہیں۔ اصل میں ان کا کمالِ سخنوری ان قصیدوں سے ظاہر ہوتا ہے۔

قصیدوں کے بعد مثنویوں کا درجہ ہے جو کل گیارہ ہیں جن میں "چراغ دیر" "باد مخالف" اور "ابر گہر بار" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ غزلیں زیادہ تر مرزا بیدل کی تقلید میں لکھی گئی ہیں اور ان کی طبیعت کا خاص رنگ جو اردو غزلوں میں نمایاں ہے فارسی غزلوں میں بھی موجود ہے۔

مجموعے

کلیات تیس بتیس سال کی عمر تک مرزا کے فارسی کلام کا ایک اچھا ذخیرہ فراہم ہو چکا تھا جس کو ۱۸۳۵ء میں انھوں نے "میخانۂ آرزو"

کے عنوان سے مرتب بھی کر لیا تھا۔ مگر یہ کلیات نظم دس سال تک شائع نہ ہو سکا۔
آخر کار نواب ضیاء الدین احمد خاں نیرؔ و رخشاںؔ کی تصحیح و ترتیب کے بعد سنہ ۱۲۶۵ھ
میں مطبع دار السلام دہلی میں چھپا۔ اس کے بعد جو کلام جمع ہوا وہ غدر میں لٹ گیا۔
اور پھر منشی نولکشور نے نیرؔ کے فرزند شہاب الدین احمد خاں ثاقبؔ سے بقیہ
کلام وصول کر کے "کلیات نظم فارسی" کا دوسرا ایڈیشن سنہ ۱۸۶۳ء میں شائع کیا۔

ابرِ گہربار

غالبؔ کی یہ سب سے بڑی مثنوی ہے جس میں گیارہ سو سے زائد
شعر ہیں۔ مرزا کا ارادہ تھا کہ "شاہ نامۂ فردوسی" کے رنگ میں
غزوات نبوی کو منظوم کیا جائے۔ لیکن صرف تمہیدی حصہ یعنے حمد و نعت و
منقبت و عرضِ حال وغیرہ لکھ سکے تھے کہ خیال چھوڑ دیا۔ کام بہت اہم اور
اطمینان طلب تھا۔ اور آرام و اطمینان مرزا کو عمر بھر نصیب نہ ہوا۔ بہرحال
یہ ناتمام مثنوی کلیات میں شامل کر دی گئی تھی۔ مگر حکیم غلام رضا خاں کے
اصرار پر مرزا نے اس کو علٰحدہ شائع کرنے کی اجازت دیدی کیونکہ اس میں
آنحضرت صلعم کے معراج مبارک کا قصہ اس خوبی اور شرح و بسط کے ساتھ منظوم
ہو گیا تھا کہ یہ بجائے خود ایک مستقل کتاب ہو گئی۔ دراصل یہی موضوع بحالت موجودہ
اس مثنوی کا ماحصل ہے۔ چنانچہ یہ سنہ ۱۲۸۰ھ میں اکمل المطابع سے شائع ہوئی
اس کے ساتھ چند رباعیاں، دو قطعے اور دو قصیدے بھی شامل کر دیئے گئے
جو کلیات میں شائع نہ ہو سکے تھے یا اس کے بعد لکھے گئے تھے۔ قصیدوں میں
پہلا لارڈ الگن کی اور دوسرا لارڈ لارنس کی مدح میں ہے۔

سبد چین

کلیات کی طباعت کے بعد مرزا نے جو قصائد و قطعات اور دوسرا

کلام لکھا تھا (جس میں کچھ "ابر گہر بار" کے ساتھ بھی شایع ہوا تھا) اس کو اس عنوان سے اگست ۱۸۶۷ء میں مطبع محمدی نے شایع کیا۔ بعد کو یہ مختصر مجموعہ نایاب ہو چکا تھا۔ ابھی ابھی ۱۹۳۸ء میں مکتبہ جامعہ نے جید برقی پریس دہلی سے اس کو دوبارہ چھپوا کر شایع کیا ہے۔ اور اس دوسرے ایڈیشن میں غالب کا جو اور کلام منتشر تھا اس کو بھی شریک کر دیا گیا ہے۔ اس مجموعہ میں ایک قصیدہ نواب کلب علی خاں والیٔ رامپور کی مدح میں بھی ہے۔

فارسی نثر

مرزا جتنے اچھے شاعر تھے اتنے ہی اعلیٰ پایہ کے نثر نگار بھی تھے۔ ان کی فارسی انشا پردازی عنفوان شباب سے شروع ہوئی جب کہ ان کی عمر اٹھائیس سال کی تھی اور بعد میں چالیس سال تک جاری رہی۔ آخر کار درفش کاویانی کی اشاعت اور اردو خطوط نویسی کے آغاز کے بعد مرزا نے فارسی میں لکھنا ترک کر دیا۔

پنج آہنگ (یہ مرزا کی پہلی تصنیف ہے) ۱۸۲۵ء میں جب انگریزوں نے بھرت پور پر چڑھائی کی تو مرزا غالب کے چچا خسر نواب احمد بخش خاں فخر الدولہ انگریزوں کی طرف سے فوج میں شامل تھے اور ان کے ہم رکاب مرزا غالب اور ان کے حقیقی سالے علی بخش خاں رنجور بھی تھے۔ اس وقت رنجور نے مرزا سے فرمائش کی کہ آپ کوئی ایسی کتاب لکھ دیں جس کے مطالعہ سے القاب و آداب اور خطوط نویسی کے لوازم سے آگاہی ہو۔ چنانچہ مرزا نے پہلے اس کتاب کے ابتدائی دو حصے لکھے اور آخر کار پانچ حصے لکھ کر اس کا نام پنج آہنگ رکھا۔ ہر حصہ کی تفصیل یہ ہے۔

آہنگ اول۔ القاب و آداب اور ان کے متعلقہ مراتب۔ **آہنگ دوم** مصادر و مصطلحات و لغات فارسی۔ **آہنگ سوم**۔ اشعار مکتوبی منتخب از دیوان غالب۔ **آہنگ چہارم**۔ کتابوں کے خطبے۔ تقریظیں اور متفرق عبارتیں۔ **آہنگ پنجم**۔ مکاتیب۔

لیکن یہ ان کے فارسی خطوط اور منثر تحریروں کا مکمل مجموعہ نہیں ہے کیونکہ

غدر میں ان کی جو تحریریں نواب ضیاء الدین احمد خاں اور حسین مرزا کے کتب خانوں سے ضائع ہوئیں ان کے علاوہ بعض اور خطوط اور تحریریں وغیرہ اس میں شامل نہیں ہیں۔

یہ کتاب دو دفعہ علیحدہ چھپی۔ ایک دفعہ منشی نور الدین کے چھاپہ خانہ میں اور ایک دفعہ مطبع سلطانی میں۔ مطبع سلطانی کے نسخہ کی تاریخ طباعت ۴ اگست ۱۸۴۹ء ہے۔ ان طباعتوں کے علاوہ پنج آہنگ مرزا کی کلیات نثر میں بھی شامل ہے جو اب تک کئی دفعہ چھپ چکی ہے۔

مہر نیم روز

جب انگریزوں کی کوشش اور اثر سے حکیم احسن اللہ خاں احترام الدولہ احترام الملک حاذق جنگ بہادر شاہ کے وزیر مقرر ہوئے تو انھوں نے دربار میں انگریزوں کے اور بہی خواہوں کے لئے بھی جگہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ انہی میں ایک مرزا غالب تھے جو انگریزوں کے پنشن خوار اور حکام انگریزی کی دوستی کی وجہ سے انگریزوں کے بہی خواہوں میں شمار کئے جاتے تھے اور اس وقت تک دربار میں جگہ نہ پا سکے تھے۔ اب حکیم صاحب نے بادشاہ کو توجہ دلائی کہ غالب جیسا ادیب اور شاعر دلی شہر میں موجود ہو اور شاہی دربار کا متوسل نہ ہو تو تعجب کی بات ہے۔ اس پر بادشاہ نے مرزا کو باریاب کر کے شاہی مورخ کی حیثیت سے ملازم رکھا لیکن مرزا کو تاریخ سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور انھوں نے غالباً انکار کر دیا جس پر وزیر نے یہ انتظام کیا کہ تاریخی معلومات خود مرتب کر کے دیتے جن کو مرزا اپنے خاص اسلوب میں قلمبند کر لیتے تھے۔ اس طرح ۴ جولائی ۱۸۵۰ء سے تاریخ نگاری کی ملازمت

شروع ہوئی جو غدر تک باقی رہی۔

اس تاریخ کا نام انھوں نے "پرتوستان" رکھا اور اس کو دو حصوں پر منقسم کر دیا۔ پہلا حصہ "مہر نیم روز" جس میں آغاز سلطنت سے ہمایوں بادشاہ تک کے حالات لکھے اور دوسرا حصہ "ماہ نیم ماہ" جس میں اکبر بادشاہ سے بہادر شاہ تک کے حالات درج کرنا چاہتے تھے لیکن اس حصہ کا صرف نام رہ گیا۔ کتاب کی ابتدا بھی نہ ہو سکی۔

مہر نیم روز دو سال کے اندر ہی یعنی مارچ ۱۸۵۲ء سے قبل مکمل ہو چکی تھی مگر دو برس تک چھپنے کی نوبت نہ آئی۔ آخر کار ۱۸۵۴ء میں فخر المطابع میں شایع ہوئی۔ بعد کو ۱۹۳۷ء میں اس کا ایک دوسرا ایڈیشن پروفیسر اولاد حسین شاداں نے تصحیح و تحشیہ کے بعد مطبع کریمی لاہور سے شایع کیا۔

دستنبو غدر کے ساتھ ہی جب قلعہ کا آنا جانا موقوف کر کے مرزا گھر بیٹھ رہے تو بیکاری میں غدر کے حالات قلمبند کرنے شروع کیے۔ جو کچھ لکھتے اس کی ایک نقل میر مہدی مجروح کو بھی بھیج دیتے تھے تاکہ ایک کے یہاں سے تلف ہو جائے تو دوسرے کے یہاں محفوظ رہے۔ مئی ۱۸۵۷ء میں لکھنا شروع کیا اور اگست ۱۸۵۸ء میں ختم کر دیا۔ ممکن ہے اور جاری رکھتے لیکن اس زمانہ میں اندور والے منشی امید سنگھ ان کے یہاں آئے اور دستنبو کا مسودہ دیکھ کر اس کے چھاپنے کا قصد کیا جس پر مرزا نے یکم اگست تک کے حالات لکھ کر کتاب ختم کر دی۔ اور ستمبر میں اس کا مسودہ منشی ہرگوپال تفتہ کے یہاں آگرہ بھیج دیا۔ وہاں منشی شیو نرائن مالک مطبع مفید خلائق نے نومبر ۱۸۵۸ء

کے پہلے ہفتہ میں اس کو چھاپ کر شایع کیا۔ یہ پورا ایڈیشن پانچ ہی مہینوں میں ختم ہوگیا۔ جب مرزا رام پور میں تھے تو حکومت پنجاب نے ان سے دستنبو کا ایک نسخہ طلب کیا۔ انھوں نے ایک نسخہ صحیح کرکے لٹریری سوسائٹی روہیل کھنڈ کے مطبع واقع بریلی میں چھپنے کو بھیجا۔ جہاں سے ۱۸۶۵ء میں دوسرا اور ۱۸۷۱ء میں تیسرا ایڈیشن شایع ہوا۔ پہلے ایڈیشن میں دستنبو کا آغاز اس قصیدہ سے کیا تھا جو ملکہ معظمہ کی مدح میں لکھا تھا لیکن بعد کو اصل نثر پہلے کر دی اور قصیدہ آخر میں۔ قصیدہ کے ساتھ مرزا نے قطعہ چراغاں بھی شامل کر دیا جو فتح دہلی کی خوشی میں چراغاں کے موقع پر اکتوبر ۱۸۵۸ء میں لکھا تھا۔

کلیات نثر

۱۲۸۰ھ میں جب منشی نولکشور دہلی آئے تو انھوں نے مرزا سے کلیات نثر چھاپنے کی اجازت چاہی۔ مرزا نے متذکرہ تین نثر کی کتابوں کو یکجا کر کے شایع کرنے کی اجازت دی۔ چنانچہ انھوں نے جنوری ۱۸۶۸ء میں اس کو پہلی بار اور ۱۸۷۱ء میں دوسری اور ۱۸۷۷ء میں تیسری بار شایع کیا۔

قاطع برہان

غدر کے زمانہ میں دستنبو کے علاوہ مرزا نے مشہور فارسی لغت برہان قاطع پر بھی حاشیے لکھنے شروع کئے۔ جب پوری کتاب دیکھ ڈالی تو آخر میں تمام حاشیوں کو یکجا کر کے قاطع برہان کے عنوان سے علحدہ لکھوالیا۔ یہ کتاب ۱۸۶۰ء سے قبل مکمل ہو چکی تھی۔ لیکن چھپنے کے سامان دو سال تک پیدا نہ ہوئے۔ آخر ۱۸۶۲ء میں نواب یوسف علیخاں کی مدد سے مطبع نولکشور سے شایع ہوئی۔

درفش کاویانی

قاطع برہان کی اشاعت سے علمی دنیا میں پھر ایک ہنگامہ

برپا ہوگیا۔ چونکہ مرزا کا لب و لہجہ درشت اور اسلوب سخت تھا اس لیے پرانی طرز کے لوگ بہت چراغ پا ہوئے اور مرزا کے خلاف کئی رسائل مثلاً ساطع برہان، قاطع القاطع، محرق قاطع، موید برہان، شمشیر تیز تر وغیرہ اور مختلف خطوط شایع ہوئے۔ مرزا نے بھی ان کے جواب لکھے اور لکھوائے، تیغ تیز، لطائف غیبی، دافع ہذیان، نامۂ غالب، اور سوالات عبدالکریم وغیرہ اسی سلسلہ میں لکھی گئیں۔

اس زمانہ میں مرزا بہت پریشان رہے اور کلکتہ میں ان کے خلاف مخالفتوں کا جو طوفان ابل پڑا تھا اس وقت اس سے زیادہ سختی اور جوش و خروش کا اظہار کیا گیا۔ ان کے یہاں گمنام خطوں میں گالیاں آنے لگیں۔ اور وہ اتنے پریشان ہو گئے کہ اپنے بعض دوستوں سے بھی بدگمانی پیدا کر لی۔

دو تین سال کی مخالفتوں کے بعد جب طوفان کچھ تھما تو مرزا نے مزید مطالب و اعتراضات کا اضافہ کر کے قاطع برہان کو دوسری دفع ڈسمبر ۱۸۶۵ء میں درفش کاویانی کے نام سے شایع کیا۔ یہ کتاب اکمل المطابع میں شایع ہوئی۔ اور اس کے لئے میر غلام بابا خاں رئیس سورت نے ان کو مدد دی تھی۔

اردو نظم

مرزا غالب نے اپنی شاعری کی ابتدا اردو ہی سے کی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ بعد کو ذوق کے مقابلہ میں انھوں نے اردو کلام کو اپنے لیے باعث ننگ ظاہر کیا اور لکھا کہ ؎

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ ۔۔۔ بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ابتدا میں غالب نے بیدل کی تقلید کی وجہ سے اپنی شاعری کو چیستان بنا لیا تھا اور خود ہی اس کا اعتراف بھی کیا کہ ؎

طرز بیدل میں ریختہ لکھنا ۔۔۔ اسد اللہ خاں قیامت ہے

لیکن آخر کار وہ سیدھے راستہ پر آ پڑے اور میر و درد کی طرز میں جو کچھ لکھا اس کی وجہ سے آج اردو کے ایک بڑے شاعر مانے جاتے ہیں۔

مرزا کی شاعرانہ عظمت کے بنانے میں مولانا فضل حق خیر آبادی کا بڑا حصہ ہے کیونکہ انھوں نے مرزا کے کلام کا رنگِ سخن بدلا اور ان کے مجموعہ میں سے ایسے اشعار چھانٹ دئیے جو مرزا کی شاعری کو بدنام کر رہے تھے اور جس کو لوگ ؎

پہلے تو روغنِ گل بھینس کے انڈے سے نکال ۔۔۔ پھر دوا جتنی ہے کل بھینس کے انڈے سے نکال

جیسی شاعری سمجھنے لگے تھے۔

دیوان کا پہلا ایڈیشن

یہ انتخاب پہلی بار ۱۲۵۴ھ م ۱۸۴۲ء میں فخر المطابع دہلی سے شایع ہوا تھا۔ اس کے آخر میں نواب ضیاء الدین احمد خاں کی تقریظ

تھی جو سر سید کی کتاب آثار الصنادید میں موجود ہے۔ اس دیوان میں کُل ۱۰۷۲ اشعر تھے یہ ایڈیشن اب تقریباً نایاب ہے۔

دوسرا ایڈیشن

پہلی طباعت کے پندرہ سال بعد یعنی ۱۲۷۱ھ میں دیوان غالب کا دوسرا ایڈیشن شایع ہوا۔ اس میں سات سو شعر زیادہ ہیں جملہ تعداد اشعار ۱۷۹۲۔ اس کی ترتیب بھی جدا ہے۔ پہلے مرزا کا فارسی دیباچہ پھر قطعات پھر ایک مثنوی پھر قصیدے، غزلیں اور رباعیاں اور آخر میں نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر ورخشاں کی تقریظ۔

۱۲۷۸ھ کے ایڈیشن

غدر کے قبل غالب نے اپنے دیوان کا ایک نسخہ نواب رامپور کے پاس بھیجا تھا اور جب وہ ۱۸۶۰ء میں رام پور گئے تو نیر ورخشاں کی فرمایش پر اس نسخہ کی نقل لیکر رکھ لی کیونکہ نیر کا نسخہ غدر میں ضایع ہو گیا تھا۔ اس نسخے کی بنا پر ۱۲۷۸ھ میں مطبع احمدی دہلی سے ایک، اور مطبع نظامی کانپور سے ایک، اس طرح دو ایڈیشن شایع ہوئے۔ ان کی ترتیب بھی مختلف ہے۔ یعنے غالب کے فارسی دیباچہ کے بعد غزلیات، پھر چار قصیدے (دو حضرت علیؑ کی منقبت میں اور دو بہادر شاہ ظفر کی مدح میں) اس کے بعد مثنوی بصفت انبہ، پھر قطعات اور آخر میں رباعیاں۔

غالب کی زندگی میں ان کے اردو کلام کے یہی چار ایڈیشن شایع ہوئے۔ ان کے بعد یوں تو دیوانِ غالب کے بیسیوں ایڈیشن چھپے لیکن بھوپال کا نسخہ حمیدیہ اور غالب نامہ کا تاریخ وار مرتبہ کلام قابل ذکر ہے۔ کیونکہ ان دونوں کے مطالعہ سے غالب کے متعلق معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ بھوپال کے "نسخہ حمیدیہ"

کی طرح شاہی کتب خانۂ رامپور میں بھی ایک دیوان غالب موجود ہے جو عنقریب شایع ہونے والا ہے۔ یہ دیوان خود مرزا نے نواب کلب علی خاں کی فرمایش پر ۱۸۶۶ء میں اپنے کلام سے منتخب کر کے تیار کیا تھا۔ اور اس کی اشاعت سے بھی مفید معلومات حاصل ہوں گی۔

باتصویر نسخے

اس سلسلہ میں برلن کے چھپے ہوئے نسخوں نیز مرقع چغتائی اور نقش چغتائی کا تذکرہ بھی ضروری ہے کیونکہ ان نفیس اور پاکیزہ ایڈیشنوں کی اشاعت سے غالب کی عظمت و مقبولیت میں خاص طور پر اضافہ ہوا۔ اور خود اردو زبان کی وقعت بھی لوگوں کی نظروں میں زیادہ ہو گئی۔

اُردو نثر

مرزا غالب فارسی شاعری کی طرح فارسی نثر کو اپنے لئے باعث فخر سمجھتے تھے اسی لیے اُردو نثر کی طرف کوئی توجہ نہ کی سب سے پہلے اردو نثر میں انھوں نے جو کچھ لکھا وہ ان کے خطوط تھے۔ سنہ ۱۲۵۱ء سے قبل ہی سے انھوں نے فارسی میں خط لکھنا ترک کر کے اردو میں لکھنا شروع کیا۔ اس کی وجہ مولوی حالی نے "مہر نیم روز" کی تصنیف کی مشغولیت بتائی ہے اور دوسرے سوانح نگاروں نے اس سے اختلاف کیا ہے۔ بہر حال اتنا ضرور ہے کہ جب سے غالب کی طبیعت میں ایک طرح کی لاپروائی اور سہل انگاری پیدا ہونی شروع ہوئی اس وقت سے اردو میں لکھنا شروع کیا کیونکہ فارسی میں ذرا تکلف اور آورد سے کام لینا پڑتا تھا اور اردو میں انھوں نے قلم برداشتہ لکھا ہے جس کی وجہ سے ان کے اردو خطوط میں بے تکلفی شگفتگی، اور لطف پیدا ہو گیا ہے۔ ان کے متعلق آخر میں لکھا جائے گا کیونکہ یہ مرزا کے آخر زمانہ میں کتاب کی صورت میں جمع ہوئے۔

نامۂ غالب

غالب کو اردو نثر میں لکھنے کی اصل ضرورت اس وقت محسوس ہوئی جب ان کی فارسی کتاب "قاطع برہان" کی تردید اور مخالفت میں متعدد کتابیں فارسی اور اردو میں لکھی جانے لگی۔ چنانچہ جب امام بخش صہبائی کے ایک شاگرد مرزا رحیم بیگ حیا میرٹھی نے "ساطع برہان" (۱۲۸۳ھ میں) شایع کی تو مرزا غالب نے اس کے جواب میں "نامۂ غالب" لکھا۔ یہ ۱۶ صفحہ کا ایک اردو رسالہ ہے جس کے تین سو نسخے غالب نے اپنے صرفہ سے چھپوا کر

دوستوں میں تقسیم کر دیئے۔ یہ مطبع محمدی دہلی میں اگست ۱۸۶۵ء میں چھپا تھا اور اب "عود ہندی" میں شامل ہے۔

لطایفِ غیبی اور سوالات عبدالکریم

قاطع برہان کی مخالفت میں ایک اور کتاب "محرق قاطع" بھی لکھی گئی تھی جس کے مصنف سید سعادت علی تھے اور جو مطبع دلہائی شاہدرہ میں ۱۸۶۴ء میں چھپی تھی۔ اس کے جواب میں مرزا نے خود دو کتابیں "لطائف غیبی" اور "سوالات عبدالکریم" لکھیں اور ان دونوں کو اپنے دوستوں کے نام سے چھپوایا۔ اول الذکر ۴۸ صفحوں کا رسالہ ہے جس میں مرزا نے اپنے مخالفین کے جواب دیئے ہیں اور اپنے ایک معتقد سیف الحق میاں داد خاں سیاح کا نام بطور مولف کے لکھ دیا ہے۔ یہ کتاب ۱۸۶۵ء میں شایع ہوئی۔ "سوالات عبدالکریم" آٹھ صفحوں کا مختصر سا رسالہ ہے جس میں غالب نے عبدالکریم کے نام سے کل سترہ سوال لکھے ہیں۔ یہ اکمل المطابع دہلی میں ۱۲۸۱ھ میں چھپا۔

تیغ تیز

"ساطع برہان" اور "محرق قاطع" کے علاوہ مرزا غالب کی "قاطع برہان" کی مخالفت میں اور دو کتابیں "قاطع القاطع" اور "موید برہان" بھی لکھی گئیں جن کے جواب میں مرزا نے ایک اردو کتاب "تیغ تیز" لکھی اس میں سترہ فصلیں ہیں۔ پہلی سولہ فصلوں میں مولوی احمد علی مولف "موید برہان" پر سولہ اعتراض کئے ہیں۔ اور آخری فصل میں "برہان قاطع" پر مزید اعتراضات لکھے ہیں آخر میں سولہ ادبی سوالوں کا استفتا اور ان کے جواب اور جوابوں کی تصدیق و تائید درج ہے جواب نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ نے لکھا تھا اور مولوی حالی

مولوی سعادت علی، اور نواب ضیاالدین احمد خاں نے ان کی تصدیق و تائید لکھی تھی۔ یہ رسالہ ۱۸۶۱ء میں اکمل المطابع میں چھپا۔

نکاتِ غالب اس سال فروری کے مہینے میں مرزا غالب کا ایک اور اردو رسالہ "نکاتِ غالب" بھی شایع ہوا اس میں فارسی زبان کے قواعد لکھے ہیں۔ اور اس کے دوسرے حصہ میں اپنے ۱۵ فارسی مکتوبات درج کیے ہیں اور اس کا نام "رقعاتِ غالب" رکھا یہ دونوں رسالے صرف ۳۶ صفحات پر مشتمل ہیں۔ اور ان کی وجہ تصنیف یہ ہوئی کہ مرزا کے ایک ہندو معتقد رائے بہادر ماسٹر پیارے لال آشوب پنجاب کے ناظم محکمہ تعلیمات میجر فلر کی دعوت پر لاہور گئے تھے تاکہ علوم مشرقیہ کی ترقی میں میجر فلر کو مدد دیں۔ میجر نے ان کو حکم دیا کہ مرزا غالب سے بھی کوئی کتاب لکھوانی چاہیے جس کی بنا پر انھوں نے مرزا سے درخواست کی اور کامیاب ہوئے۔ یہ کتاب محمد سعادت علی خاں کے مطبع سراجی سے ۱۸۶۷ء میں شایع ہوئی اور اب کم یاب ہے۔

قادر نامہ زین العابدین خاں عارف کے دونوں بچے باقر علی خاں اور حسین علی خاں مرزا غالب ہی کے زیرِ پرورش تھے۔ ان کی تعلیم کے لیے مرزا نے خالق باری اور آمدنامہ کی طرز پر ۱۲۷ شعروں میں اردو اور فارسی لغات کو منظوم کیا ہے۔ درمیان میں دو غزلیں اور آخر میں چار شعر کا ایک قطعہ بھی شامل ہے۔ یہ آٹھ صفحوں کا مختصر سا رسالہ پہلی بار اکتوبر ۱۸۷۳ء کو مطبع منشی مداری لال لاہور سے شایع ہوا اور اس کے بعد "قادر نامہ" کے اور متعدد اڈیشن بھی چھپے۔

عودِ ہندی

غالب نے اپنی وفات سے تقریباً بیس سال قبل ہی سے اردو میں خط لکھنے شروع کر دیئے تھے۔ اور ان کے خطوط کی شگفتگی اور لطافت نے ان کے احباب میں خاص شہرت حاصل کر لی تھی لیکن ان سب کو جمع کر کے شایع کرنے کا خیال ان کی وفات سے صرف سات سال قبل پیدا ہوا۔ ابتدا میں غالب راضی نہ ہوئے اور منشی شیونرائن کو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ "ان کا چھاپنا میرے خلافِ طبع ہے۔" آخر کار ممتاز علی میرٹھی نے سب سے پہلے عملی قدم اٹھایا اور چودھری عبدالغفور سرور اور صاحب عالم وشاہ عالم صاحبان کے نام کے ۲۱ خطوط ۱۸۶۲ء ہی تک جمع کر لئے۔ جن پر سرور نے ایک دیباچہ اور قطعۂ تاریخ بھی لکھ دیا لیکن بعد کو ممتاز علی خاں کو خیال آیا کہ بعض دیگر حضرات کے خطوط بھی جمع کئے جا سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے خواجہ غلام غوث خاں بیخبر کی مدد سے ۱۳۰ خطوط اور جمع کئے۔ ان کے علاوہ تقریظیں اور نثر کے دو سہرے نوٹ بھی حاصل کر لئے۔ اس طرح پانچ سال میں مسودہ مکمل کر کے "عودِ ہندی" نام رکھا اور ستمبر ۱۸۶۷ء میں مطبع مجتبائی میرٹھ کو بغرض طباعت دے دیا۔ لیکن اس کو چھپتے چھپتے دو سال لگ گئے اور آخر کار یہ ۱۹ اکتوبر ۱۸۶۸ء کو اس وقت شایع ہوا جب مرزا غالب دنیا میں صرف چار ماہ کے لئے موجود تھے۔

اُردوئے معلّیٰ

ممتاز علی خاں کی تحریک کا جب غالب کے دوستوں اور شاگردوں کو علم ہوا تو وہ ان کے خطوط کے مجموعہ کی اشاعت کے لئے چشم براہ ہو گئے اور مرزا پر اس کی اشاعت کا تقاضا شروع کیا۔ مرزا آخر تنگ آ گئے اور اپنی طرف سے بھی اپنے مرسلہ خطوط کے واپس ملنے کی کوشش شروع کی۔ ممتاز علی خاں کی تعویق سے ان کو شبہ ہوا کہ شاید اب وہ نہ چھاپیں گے

چنانچہ انھوں نے خواجہ غلام غوث خاں بےخبر کو لکھا کہ :-

"اجی حضرت! یہ منشی ممتاز علی خاں کیا کر رہے ہیں۔ رقعے جمع کیے اور نہ چھپوائے۔ فی الحال پنجاب احاطہ میں ان کی بڑی خواہش ہے۔ جانتا ہوں کہ وہ آپ کو کہاں ملیں گے جو آپ ان سے کہیں۔ مگر یہ تو حضرت کے اختیار میں ہے کہ جتنے میرے خطوط آپ کو پہنچے ہیں وہ سب یا ان سب کی نقل بطریق پارسل آپ مجھ کو بھیج دیں۔ جی یوں چاہتا ہے کہ اس خط کا جواب وہی پارسل ہو۔"

اس سلسلہ میں مرزا کے شاگرد منشی جواہر سنگھ جوہر نے میر فخر الدین مہتمم اکمل المطابع کے ساتھ مل کر مرزا کے خطوط جمع کرنے شروع کیے۔ لیکن مرزا کی یہ خواہش ان کے جیتے جی پوری نہ ہوئی کیونکہ یہ مجموعہ "اردوئے معلیٰ" ان کی وفات کے بعد مارچ ۱۸۶۹ء میں شائع ہوا۔

غالب کے بعد خطوط غالب کے ان دو مجموعوں کی اشاعت کے بعد ان کے متعدد خطوط اور دستیاب ہوئے ہیں جو رسالوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے کئی خط چھاپے اور ان کے متعلق تحقیقی مضامین لکھے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ڈاکٹر صدیقی اور پنڈت مہیش پرشاد یہ دونوں صاحبین مرزا غالب کی تصنیفات کے متعلق اچھی بصیرت رکھتے ہیں اور اس موضوع پر ان کے محققانہ مضامین کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ موخر الذکر نے غیر مطبوعہ خطوط کا ایک بہت بڑا ذخیرہ جمع کر لیا ہے۔ ان کی اشاعت کے بعد غالب اور ان کے کارناموں کے متعلق ہماری معلومات میں اور بھی اضافہ ہوگا۔

مکاتیبِ غالب | مرزا کے بعد جب ان کے غیر مطبوعہ کلام اور تحریروں کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہو تی گئی تو جہاں بھوپال کے کتب خانہ سے دیوانِ غالب کا "نسخہ حمیدیہ" شائع ہوا، رامپور کے کتب خانہ سے "مکاتیب غالب" بھی خاص اہتمام اور مقدمات کے ساتھ شایع کیے گئے۔ دربار رامپور سے مرزا کی خط و کتابت بارہ برس (جنوری ۱۸۵۷ء سے فروری ۱۸۶۹ء) تک جاری رہی یعنے آٹھ سال نواب یوسف علی خاں کے ساتھ اور چار سال نواب کلب علی خاں کے ساتھ۔ یہ تمام خطوط ریاست کے دارالانشاء میں محفوظ تھے اور ان کو سنہ ۱۹۳۷ء کے آغاز میں امتیاز علی صاحب عرشی ناظم کتب خانہ رامپور نے نہایت اہتمام سے مرتب کر کے شایع کیا ہے۔ اس مجموعہ میں کل ۱۱۵ خطوط ہیں۔ اور حاشیہ پر ان خطوط کی نقلیں بھی چھاپ دی گئی ہیں جو ریاست کی طرف سے مرزا کے مکاتیب کے جواب میں بھیجے گئے تھے۔ ان سے غالب کی زندگی، تعلقات اور دیگر حالات پر اچھی روشنی پڑتی ہے۔

غالب کے اعزّہ و احباب

اعزّہ

بیوی اور اولاد

مرزا غالب کی بیوی دلّی کے ایک شریف اور رئیس خاندان کی حلیم الطبع اور متقی و پرہیزگار خاتون تھیں جن کے والد الٰہی بخش خاں معروف ایک صاحب ذوق اور علم دوست امیر تھے۔ وہ پاکیزہ شاعر اور خانہ نشین صوفی تھے۔ اور شاعروں اور اپنے معتقدوں کی ہمیشہ امداد کرتے رہتے تھے۔ ان کی دو لڑکیاں بنیادی بیگم اور امراؤ بیگم اور دو فرزند علی بخش خاں رنجور اور علی نواز خاں تھے۔ چھوٹی دختر امراؤ بیگم کی شادی نہایت کمسنی میں مرزا غالب سے ۷ رجب ۱۲۲۵ھ (۱۸۱۰ء) کو ہوئی۔ انھوں نے اپنے رنگین مزاج شوہر کی عادات و اطوار کی اصلاح میں بہت کچھ حصہ لیا اور زمانۂ فلاکت میں اپنے پریشان حال خاوند کا ہر طرح سے ساتھ دیا۔ یہاں تک کہ اپنے زیور اور کپڑے بھی فروخت کے لئے دے ڈالے۔ انھوں نے خود بھی تمام عمر اپنے شوہر کی طرح افلاس میں گزاری اور خاص کر جب مرزا نے مقروض انتقال کیا تو ان کے بعد ان کے قرضوں کی ادائی اور اپنی زندگی کو عزت سے گزارنے میں بےحد زحمت اٹھائی۔ آخرکار مرزا کے بعد ایک سال کے اندر اندر انھوں نے بھی ۴ فروری ۱۸۷۰ء کو مرزا کی برسی کے روز ہی انتقال کیا۔ اس وقت ان کی عمر ستر سال کے قریب ہوگی۔

مرزا کے تعلقات اپنی بیوی کے ساتھ کچھ زیادہ شگفتہ نہ تھے۔ دونوں کی

طبیعتوں میں بیحد اختلاف تھا۔ انشا کا مصرعہ کہ ع

میں ہوں ہنوز تو ہے مقطع میرا تیرا میل نہیں

ان دونوں پر پوری طرح منطبق ہوتا ہے۔ مرزا ظریف الطبع، رند مشرب، یار باش اور جدت پسند تھے تو ان کی بیوی متقی، پرہیز گار، پابند صوم وصلوٰۃ، اور قدامت پسند تھیں۔ دونوں کے کھانے پینے کے برتن علیحدہ ہو گئے تھے۔ اور مرزا اپنی ظریفانہ طبیعت کے اقتضا سے اپنی بیوی کے ساتھ بھی موقع بہ موقع ظرافت و مزاح سے نہیں چوکتے تھے۔ اس سے متعلق ان کے کئی لطیفے مشہور ہیں اور مولوی حالی نے بھی "یادگار غالب" میں نقل کئے ہیں۔

ان کے اگرچہ سات بچے ہوئے مگر کوئی سال ڈیڑھ سال سے زیادہ نہ جیا۔ یہ بھی ایک وجہ ہوگی کہ مرزا اپنی بیوی اور زنانہ مکان کی طرف زیادہ توجہ نہ رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ بیوی کی عبادت گزاری اور تقوے کا خیال بھی پیش نظر ہوگا۔ کیونکہ ایک لطیفہ یہ بھی ہے کہ وہ زنانہ مکان میں اس طرح جوتے اتار کر ادب سے داخل ہوتے جیسے کوئی مسجد یا درگاہ میں جا رہا ہے۔

زین العابدین خاں عارف اور ان کی اولاد

غالب کی سالی بنیادی بیگم غلام حسین خاں مسرور سے بیاہی تھیں جن کے فرزند زین العابدین خاں عارف کو مرزا بہت چاہتے تھے اور ان کی شرافت طبع، اور شاعرانہ ذوق کی قدر کرتے تھے چنانچہ جب انھوں نے عین عالم جوانی میں ۱۸۵۲ء ۱۲۶۸ھ میں انتقال کیا تو غالب نے وہ پُر درد مرثیہ لکھا جو ان کے کلام کا سب سے زیادہ موثر نمونہ ہے اور جس کا ایک

مصرعہ درد و محبت سے بھرا ہوا ہے۔ اس کا صرف حسب ذیل مطلع ہی مرزا کے جذبات غم والم کے اظہار کے لیئے کافی ہے ؎

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور — تنہا گئے کیوں، اب رہو تنہا کوئی دن اور

اس مرثیہ کے علاوہ غالب نے عارف کی زندگی ہی میں ان کے متعلق حسب ذیل قطعہ لکھا تھا جس سے غالب کی محبت کا اندازہ ہوسکتا ہے ؎

آں پسندیدہ خوئے عارف نام — کہ رخش شمع دودمانِ منست
از نشاطِ نگارشِ نامش — خامہ رقاص در بنانِ منست
آنکہ در بزم قرب و خلوتِ انس — غمگسارِ مزاج دانِ منست
زورِ بازوئے کامرانیٔ من — راحتِ روحِ ناتوانِ منست
سود سرمایۂ کمالِ منی — سخنت گنج شائگانِ منست
اے کہ میراث خوارِ من باشی — اندر ارزد کہ آں زبانِ منست
از معانی ز مبدءِ فیاض — باد آنِ تو ہرچہ آنِ منست

افسوس کہ غالب کی دعائیں بے کار گئیں۔ اور عارف کو اس میراث کا موقع نہ ملا۔

عارف کے دو۲ فرزند تھے۔ باقر علی خاں کامل اور حسین علی خاں شاداں۔ باپ کے بعد مرزا اور ان کی بیوی نے ان دونوں کو اپنے بچوں کی طرح پرورش کیا اور ان کے کھیل کود، تعلیم و تربیت، اور بعد کو معیشت و ملازمت کے لئے ہر طرح سے کوشش کی۔ باقر علی خاں کی شادی سترہ سال کی عمر میں نواب ضیاالدین احمد خاں کی دختر معظم زمانی بیگم سے کرادی ان کے تین صاحبزادیاں ہوئیں۔

بڑی صاحبزادی محمد سلطان بیگم کی پیدائش کا قطعہ تاریخ بھی غالب نے لکھا تھا جو "سبد چین" میں موجود ہے۔

باقر علی خاں اپنے باپ کے انتقال کے وقت صرف پانچ سال کے تھے۔ اس وقت سے غالب کے زیر پرورش رہے۔ بیس سال کی عمر میں مرزا نے ان کو مہاراجہ الور کے یہاں ملازم کرا دیا تھا۔ انھوں نے بھی اپنے باپ کی طرح عین عالم شباب میں ۲۸ سال کی عمر میں ۱۲۹۳ھ ۱۸۷۶ء میں انتقال کیا۔

حسین علی خاں ۱۸۵۰ء میں پیدا ہوئے تھے اور عارف کے انتقال کے وقت صرف دو سال کے تھے۔ غالب ان کو بیحد چاہتے تھے اور آخر زمانہ میں ان کی شادی کی فکروں میں تھے کہ انتقال ہو گیا۔ حسین علی خاں نے رامپور میں کچھ دنوں ملازمت کی مگر یہ بھی باپ اور بھائی کی طرح جواں مرگ ثابت ہوئے اور ۱۸۸۰ء میں تیئس سال کی عمر میں انتقال کیا۔

ضیاء الدین احمد خاں

عارف اور ان کے بچوں کے بعد مرزا کو نواب ضیاء الدین احمد خاں اور ان کی اولاد سے تعلق خاطر تھا۔

یہ غالب کی بیوی کے حقیقی چچا زاد بھائی تھے اور اپنے سسرالی عزیزوں میں غالب کو سب سے زیادہ انہی سے محبت تھی یہ غالب کے ارشد تلامذہ میں ہونے کے علاوہ ان کے شفیق دوست اور سچے قدرداں بھی تھے چنانچہ مالی پریشانی کے زمانہ میں مرزا کی بیوی کو پچاس روپے ماہوار دیا کرتے تھے۔ نیر فارسی میں اور رخشاں اردو میں تخلص کرتے تھے۔ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے مورخ اور بڑے عالم و فاضل تھے۔ مرزا کے اعزہ میں ان سے بڑھ کر صاحب ذوق، علم پرور اور سلیقہ مند

کوئی نہ تھا۔ غالب نے ان کی تعریف میں ایک فصیح و بلیغ قصیدہ لکھا ہے جس میں
ان کی عنایتوں کے اعتراف کے ساتھ اس امر کا بھی تذکرہ کیا ہے کہ ذوق شعر
و سخن میں نیر میرا نمونہ ہیں۔ ان کا شعر ہے ؎

بہ نکتہ شیوۂ شاگرد من بہ من ماند — صنم بصورت خود می تراشد آذرِ من

نواب ضیاء الدین خاں نے بڑی تلاش اور محنت سے ایک عظیم الشان
کتب خانہ جمع کر لیا تھا مگر افسوس ہے کہ غدر کے ہنگامہ میں وہ بھی تلف ہو گیا۔
انھوں نے غالب کے کلام کی حفاظت اور اشاعت میں بھی بڑا حصہ لیا ہے۔
مشہور انگریز مورخ الیٹ نے تاریخ ہند کی تالیف میں نیر رخشاں سے
استفادہ کیا تھا۔ انھوں نے ۱۳۰۲ھ ۱۸۸۴ء میں وفات پائی اور میر مہدی مجروح
نے اس مصرعہ میں کہ ع "اب نہ باقی رہی وہ رونق و شان دہلی" ان کی
وفات کی بالکل صحیح تاریخ نکالی ہے کیونکہ ان کے بعد دلی کے قدیم علم دوست
اور صاحب ذوق بزرگوں کا کوئی نمونہ باقی نہ رہا۔ غالب نے ان کے متعلق
بالکل سچ لکھا تھا ؎

بہ دین و دانش و دولت یگانۂ آفاق — بہ عمر کہتر و از روئے رتبہ بہتر من

ضیاء الدین احمد خاں کی اولاد میں شہاب الدین ثاقب اور سعید الدین
طالب مشہور ہوئے اور ان کی دختر معظم زمانی بیگم زوجہ باقر علی خاں کا ذکر
گزر چکا ہے۔ ثاقب کو بھی مرزا بہت چاہتے تھے۔

علاء الدین احمد خاں

علاء الدین احمد خاں علائی بھتیجے تھے نیر رخشاں
کے۔ ان کے والد نواب امین الدین احمد خاں

لوہارو کے رئیس اور نیر کے بڑے بھائی تھے۔ اور باپ بیٹے دونوں سے غالب کے اچھے تعلقات تھے۔ چونکہ امین الدین احمد خاں اکثر لوہارو میں رہتے تھے اور خاندان میں بڑے تھے اس لئے غالب سے ویسی بے تکلفی نہ تھی جیسی ان کے چھوٹے بھائی نیر اور ان کے فرزند علائی سے تھی۔ لیکن وہ بھی غالب کے قدردان اور ہمدردوں سے تھے اور ان کی بیوی (جو امین الدین خاں کی چچازاد بہن تھیں) کی ہر طرح سے بزرگداشت اور مدد کرتے رہتے تھے۔ ان میں اور ان کے فرزند علائی میں جب ۱۸۶۵ء میں کسی سلسلہ میں رنجش ہو گئی تو غالب نے دونوں میں صفائی کرا دینے کی ہر طرح سے کوشش کی۔ چنانچہ ان کے خطوط سے واضح ہوتا ہے کہ وہ کس طرح فرزند سے خوش ہو جانے کے لیے امین الدین احمد خاں کی خوشامد کرتے ہیں۔ اور ان کو شگفتہ رکھنے کے لئے کوشاں ہیں۔

علاء الدین احمد خاں غالب کے خاص تربیت یافتہ اور منظور نظر تھے۔ عارف کے بعد غالب انہی کو چاہتے تھے۔ اور ۱۸۶۳ء میں فارسی نظم و نثر میں اپنی جانشینی کی ایک سند لکھ دی تھی۔ جس کے چند آخری جملے یہ ہیں:

”می نگری کہ برادرزادۂ نامور روشن دل روشن گہر میرزا علاء الدین خاں بہادر بہ فر بابِ خرد خداداد راہِ سخن بہ رہنمائی من رفت۔ و در پیری من و برنائی خویش بہ بزمستانِ سخن گستری جائے من از من گرفت۔ اینک چناں کہ در خویشاوندی و یگانگی مردم چشم جہاں بین منست۔ پر چار بالش ہنرمندی و فرزانگی جانشینِ منست الخ۔“

اسی طرح ۱۸۶۸ء میں علاء الدین احمد خاں کو اردو میں بھی اپنا جانشین قرار
دیکر ایک اور سند لکھ دی تھی جس کی عبارت یہ ہے:-

اقبال نشان والاشان صدرہ عزیز تر از جان میرزا علاء الدین خاں
کو دعائے درویشانہ غالبِ دیوانہ پہنچے۔ سال گذشتہ تم کو یاد ہو گا
میں نے دبستانِ فارسی کا تم کو اپنا جانشین و خلیفہ قرار دیکر ایک سجل
لکھ دیا ہے۔ اب جو چار کم اسّی برس کی عمر ہوئی اور جانا کہ میری زندگی
برسوں کیا مہینوں کی نہ رہی۔ شاید بارہ مہینے جس کو ایک برس کہتے
ہیں اور جیوں۔ ورنہ دو چار مہینے پانچ سات ہفتے، دس بیس دن
کی بات رہ گئی ہے۔ اپنے اثبات حواس میں اپنی دستخط سے یہ توقیع
تم کو لکھ دیتا ہوں کہ فن اردو میں نظماً و نثراً تم میرے جانشین ہو۔
چاہیے کہ میرے جاننے والے جیسا مجھ کو جانتے تھے ویسا تم کو جانیں۔
اور جس طرح مجھ کو مانتے تھے تم کو مانیں۔ کُل شیئ ھالک الا وجہہ و یبقیٰ
وجہ ربک ذو الجلال والاکرام

یکشنبہ سلخ صفر ۱۲۸۵ھ ۲۱ جون ۱۸۶۸ء از دہلی:-

غالب کی یہ پیشین گوئی صحیح نکلی چنانچہ وہ نو ماہ کے اندر ہی ۲ ذیقعدہ ۱۲۵۸ھ
کو فوت ہو گئے اور یہ تحریر ان کی آخری دستخطی تحریر ثابت ہوئی۔

علاء الدین احمد خاں کے نام متعدد خطوط موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے
کہ واقعی غالب ان کو اور ان کے بچوں کو بہت چاہتے اور اپنا وارث سمجھتے
تھے۔ یہ بھی اچھے شاعر اور صاحبِ ذوق امیر تھے اور اپنے والد کے بعد

لوہارو کے رئیس ہوئے تھے۔

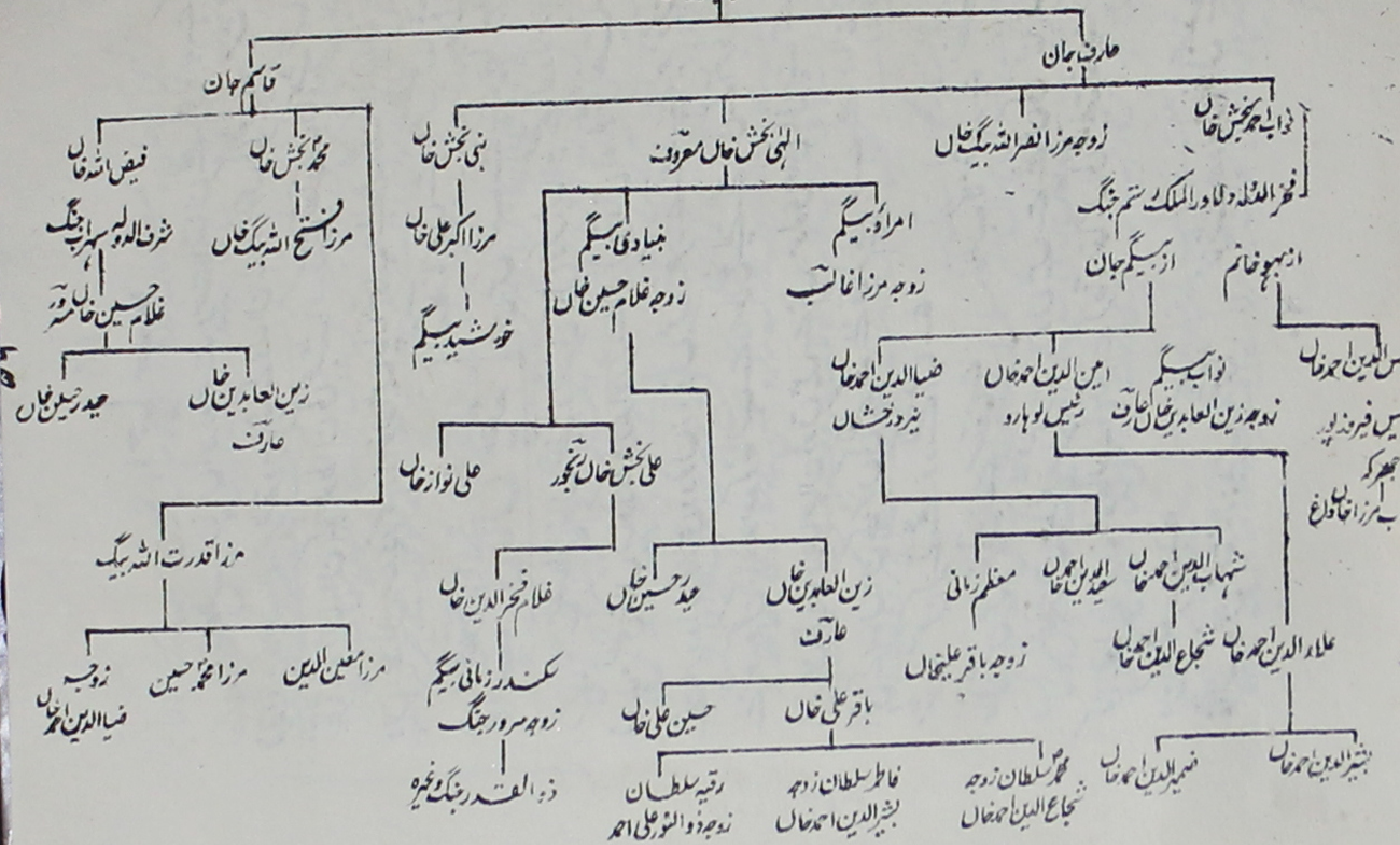
غالب کے اعزہ میں یوں تو اور بہت سے مشہور و معروف اصحاب کا ذکر کیا جاسکتا ہے لیکن یہاں صرف انہی کا تذکرہ کیا گیا جنہوں نے غالب کی زندگی اور کارناموں میں کوئی حصہ لیا تھا۔ ان کے علاوہ جن اعزہ کے نام غالب کی تحریروں اور خاص کر خطوط میں ملتے ہیں ان سب کے تعلقات ان شجروں سے ظاہر ہوں گے جو یہاں (خاص طور پر تیار کر کے) درج کیے جا رہے ہیں۔

مرزا غالب کے اعزّہ

- حسام الدولہ
  - خواجہ غلام حسین خاں کمیدان
    - عزت النساء
      - غالب
      - مرزا یوسف
        - عزیز النساء، زوجہ غلام فخر الدین خاں
          - سکندر زمانی بیگم زوجہ سرور جنگ
      - چھوٹی خانم زوجہ مرزا اکبر بیگ
        - امانی خانم زوجہ علی بخش خاں رنجور
          - غلام فخر الدین خاں
        - مرزا عاشور بیگ
          - مرزا احمد بیگ
        - مرزا عباس بیگ
        - مرزا مغل بیگ
          - سرور جنگ

- ترسم خاں
  - عبداللہ بیگ خاں
  - نصر اللہ بیگ خاں
  - دختر
    - امیر النساء بیگم زوجہ خواجہ حاجی خاں
  - دختر
    - جواد الدولہ مرزا افضل بیگ
      - مرزا فرحت اللہ بیگ
  - دختر
  - زوجہ مبارک علی بیگ برلاس
    - مونی بیگم زوجہ اکبر علی بیگ کوتوال آگرہ
      - وقار علی بیگ
        - نیاز علی بیگ

- رستم خاں
  - خواجہ قطب الدین خاں
    - خواجہ حاجی خاں
      - شمس الدین خاں
      - خواجہ جان
      - بدر الدین خاں خواجہ


مرزا غالب کے سسرالی اعزہ
خواجہ عبدالرحمن
عارف جان
قاسم جان
نواب احمد بخش خاں
زوجہ مرزا نصراللہ بیگ خاں
الٰہی بخش خاں معروف
نبی بخش خاں
محمد بخش خاں
فیض اللہ خاں
فخرالدولہ دلاور الملک رستم جنگ
امراؤ بیگم
زوجہ مرزا غالب
بنیادی بیگم
زوجہ غلام حسین خاں
مرزا اکبر علی خاں
خورشید بیگم
مرزا فتح اللہ بیگ خاں
شرف الدولہ سہراب جنگ
غلام حسین خاں مسرور
از بیگم جان
از بہو خانم
زین العابدین خاں
عارف
حیدر حسین خاں
ضیاء الدین احمد خاں
نیر درخشاں
امین الدین احمد خاں
رئیس لوہارو
نواب بیگم
زوجہ زین العابدین خاں عارف
س الدین احمد خاں
یس فیروزپور
جھرکہ
ب مرزا داغ
علی بخش خاں رنجور
علی نواز خاں
مرزا قدرت اللہ بیگ
غلام فخرالدین خاں
سکندر زمانی بیگم
زوجہ سرور جنگ
ذوالقدر جنگ وغیرہ
حیدر حسین خاں
زین العابدین خاں
عارف
شہاب الدین احمد خاں
سعید الدین احمد خاں
معظم زمانی
زوجہ باقر علی خاں
علاء الدین احمد خاں
شجاع الدین احمد خاں
مرزا معین الدین
مرزا محمد حسین
زوجہ
ضیاء الدین احمد خاں
باقر علی خاں
حسین علی خاں
بشیر الدین احمد خاں
نصیر الدین احمد خاں
محمد سلطان زوجہ
شجاع الدین احمد خاں
فاطمہ سلطان زوجہ
بشیر الدین احمد خاں
رقیہ سلطان
زوجہ ذوالنور علی احمد

احباب

مرزا غالب یار باش اور دوست پرست انسان تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر فرقہ اور ہر مذہب اور ہر طبقہ و ہر پیشہ کے لوگ ان کے دوستوں کی طویل فہرست میں نظر آتے ہیں۔ ان کے خطوط ان کی محبت اور وسیع تعلقات کی ہمیشہ شہادت دیں گے۔ ان ہندو و مسلم دوستوں میں چار اصحاب ایسے ہیں جن کا ان کی زندگی اور کارناموں سے خاص تعلق رہا ہے۔

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ

ان میں سب سے پہلے جہانگیر آباد کے رئیس نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ و حسرتی قابل ذکر ہیں۔ یہ عظیم الدولہ سرفراز الملک نواب مرتضیٰ خاں بہادر کے فرزند اور بڑے خوش ذوق اور خوش گفتار شاعر تھے۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ پہلے حکیم مومن خاں سے مشورہ سخن کیا اور بعد کو غالب سے اصلاح لینے لگے۔ دلی کے آخری دور کے چند بہترین علماء اور صاحبان ذوق میں سے ہیں۔ مولوی حالی پانی پت سے آکر انہی کے یہاں ان کے بچوں کی تعلیم کے لئے قیام پذیر ہوئے تھے اور ان ہی سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں ؎

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفید ہے
غالب کا معتقد ہے مقلد ہے میر کا

شیفتہ ان چند خوش قسمت بزرگوں میں سے تھے جن کی سخن فہمی پر غالب کو ناز تھا چنانچہ وہ شعر غالب کی نظر سے گر جاتا تھا جس کی شیفتہ تعریف نہ کرتے۔ ان کا شعر ہے ؎

غالب بہ فن ریختہ ناز د بدیں ارزش کہ او
ننوشت در دیوان غزل تا مصطفیٰ خاں خوش نکرد

سخن فہمی کے علاوہ مصطفےٰ خاں میں اور بھی خوبیاں تھیں۔ سب سے بڑی خوبی ان کی انسانی ہمدردی تھی جس سے غالب ایسے وقت میں مستفید ہوئے جبکہ ان کے اعزہ بھی ان کی امداد کو اپنے لئے باعث ننگ سمجھتے تھے۔ وہ جب جوئے کے الزام میں قید ہو کر مجلس میں داخل ہوئے تو معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کے قریبی اعزہ بھی انجان بن گئے لیکن نواب شیفتہ نے خلوص سے خبر گیری کی۔ وہ روزانہ کھانا اور کپڑے بھیجا کرتے تھے۔ چنانچہ مرزا نے اپنی اس نظم میں جو قید خانہ میں لکھی تھی ان کا اس طرح ذکر کیا ہے ؎

خود چرا خوں خورم از غم کہ بہ غمخواری من | رحمت حق بہ لباس بشر آمد گوئی
خواجہ ہست دریں شہر کہ از پرسش وے | پایۂ خویشتنم در نظر آمد گوئی
مصطفےٰ خاں کہ دریں واقعہ غمخوار من است | گر بمیرم چہ غم از مرگ عزادار من است

شیفتہ نے اردو شاعروں کا ایک تذکرہ "گلشن بے خار" بھی لکھا تھا جو اصابت رائے اور انتخاب کلام کے لحاظ سے اردو کے بہترین تذکروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ انھوں نے جس شاعر کے متعلق جو رائے ظاہر کر دی ہے وہ ہر زمانہ میں مستند سمجھی جائے گی۔

غدر کے زمانہ میں جہاں اکثر مسلمان صاحبان علم و فضل اور امرا اور رؤسا قید ہوئے نواب مصطفےٰ خاں پر بھی شبہ کیا گیا اور وہ بھی قید ہو گئے جس کا غالب کو بڑا قلق رہا۔ آخر کار جب ان کے بری ہونے کی اطلاع ملی تو مرزا بیحد خوش ہوئے۔ نواب شیفتہ نے غالب کے چند ماہ بعد ترسٹھ سال کی عمر میں ۱۲۸۶ھ ۱۸۶۹ء میں وفات پائی۔ ان کی تعریف میں مرزا نے ایک قصیدہ لکھا تھا جس کی تشبیب کے

چند شعر یہ ہیں ؎

دست رو بر تاج قیصر می زنم | پشت پا بر تخت خاقاں می زنم
آں ہمائے تیز پروازم کہ بال | در ہوائے مصطفےٰ خاں می زنم
عرفی و خاقانیش فرماں پذیر | سکہ در شیراز و شرواں می زنم
او سر آمد ست و من چاؤش وار | بانگ بر اجرام ارکاں می زنم
گلشن کویش گذر گاہ من است | دم ز یاری می زنم ہاں می زنم
مہر ورزی بیں کہ باشم ہم نشیں | من کہ زانو پیش درباں می زنم

مولانا فضل حق خیر آبادی

وہ بزرگ ہستی ہے جس نے غالب کے اخلاق و عادات اور شاعری کی اصلاح میں بہت بڑا حصہ لیا۔ ان کی بزرگی و عظمت کا اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مرزا جیسے خود رائے اور آزادہ رو شاعر و ادیب جن کی نظر میں بڑے بڑے متقدمین شعراء و علماء نہیں جچتے تھے، مولانا کی بڑی تعظیم اور عزت کرتے تھے۔ چنانچہ جب وہ دہلی سے سر رشتہ داری عدالت چھوڑ کر جانے لگے تو مرزا نے اخبار آئینۂ سکندر میں اشاعت کے لئے ایک تحریر بھیجی جس کا آخری جملہ یہ ہے:۔

"حقا کہ اگر پایۂ علم و فضل و دانش و بینش مولوی فضل حق آں مایہ بکاہند کہ از صد یک وا ماند و باز آں پایہ را بہ سر رشتہ داری عدالت دلوانی سنجند ہنوز ایں عہدہ دون مرتبۂ وے خواہد بود"

مولانا ۱۲۱۲ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولانا فضل امام صاحب خیر آبادی

کے رہنے والے تھے ان کے علم وفضل و دانش کا ہر جگہ شہرہ تھا۔ امیر مینائی نے "انتخاب یادگار" میں فضل حق کی نسبت لکھا کہ:۔

"بڑے ادیب، بڑے منطقی، نہایت ذہین، نہایت ذکی، طلیق اللسان انتہا کے صاحب تدقیق و تحقیق۔ جس شہر میں آپ رونق افروز ہوئے صدہا آدمی بہرہ اندوز ہوئے۔ شاہجہاں آباد میں اگرچہ علاالتین کے سررشتہ دار تھے، مگر بڑے ذی اقتدار اور صاحب اختیار تھے۔ جھجر میں مشاہرۂ جلیلہ پر نوکر رہے۔ الور اور سہارنپور اور ٹونک سب جگہ معزز و موقر رہے۔ لکھنؤ میں صدر الصدور رہے اور اس دار الریاست (رامپور) میں پہلے محکمۂ نظامت اور پھر علاالتین پر مامور تھے۔ جناب مستطاب نواب فردوس مکان کو بھی آپ سے تلمذ رہا ہے۔ اور بندگان حضور (نواب خلد آشیاں) نے بھی کچھ پڑھا ہے۔ آٹھ برس بہت اعزاز و اکرام کے ساتھ رہے۔ پھر یہاں سے تشریف لے گئے۔"

دہلی کے قیام کے زمانہ میں مرزا سے ایسی دوستی ہو گئی کہ عمر بھر مرزا ان کے معتقد رہے۔ مرزا کا جو منتخب دیوان اس وقت متداول ہے وہ مولانا ہی کا منتخب کردہ ہے۔ مولانا نے مرزا کی شاعری کو صحیح راستہ پر ڈال دیا ورنہ کیا تعجب کہ وہ اسی طرح آوارہ گردی کرتے رہتے۔ مولانا نے کسی معاملہ میں ناراض ہو کر اپنی خودداری کے اقتضا سے دلی کی سررشتہ داری سے استعفیٰ دے دیا اور وہاں سے نواب فیض محمد خاں کی دعوت پر جھجر تشریف لے گئے۔

ان کی جدائی کا مرزا اور اہلِ دہلی کو بڑا صدمہ ہوا۔

غدر ۱۸۵۷ء میں جہاں اکثر مسلمان علماء و فضلا پر تباہی آئی مولانا بھی بغاوت کے جرم میں گرفتار ہوئے اور جزائر انڈمان کو جلاوطن کر دیئے گئے۔ مرزا غالب اپنے دوستوں کو کلکتہ خطوط لکھ کر ان کے متعلق حالات دریافت کرتے رہتے تھے۔ ان کو آخر تک ان کی فکر رہی کہ نہ معلوم انڈمان میں کیسی گزرتی ہوگی۔ آخر کار مولانا نے غالب کی زندگی ہی میں ۲ صفر ۱۲۷۸ھ کو غریب الوطنی میں انتقال کیا۔ ان کا نام ان شہدائے ملت کے سر فہرست رہے گا جو حق گوئی صداقت اور علم و فضل کی خاطر ہر طرح کا نقصان برداشت کر لیتے ہیں۔

مولانا صاحب تصنیف و تالیف تھے اور ان کی تصنیفات کی ایک طویل فہرست ہے۔

مفتی صدر الدین خاں آزردہ دہلی کے صدر الصدور اور غالب کے خاص احباب میں سے تھے اور علم و فضل اور سخن فہمی و سخنوری میں ممتاز تھے۔ ان کی نسبت غالب نے لکھا تھا ؎

ہند را خوش نفس سخنور کہ بود — باد در خلوتِ شاں مشک فشاں از دم شاں

مومن و نیر و صہبائی و علوی و انگاہ — حسرتی، اشرف و آزردہ بود اعظم شاں

آزردہ ان مخصوص بزرگوں میں سے ہیں جنھوں نے غالب کے ذوقِ سخن پر بڑا اچھا اثر ڈالا اور خود غالب کے فضل و کمال کے معترف اور قدرداں تھے۔ غدر کے زمانہ میں یہ بھی گرفتار ہوئے تھے لیکن پھر بچ گئے۔ غالب کے ساتھ ان کے جو مخلصانہ تعلقات تھے ان کا تذکرہ یادگارِ غالب میں جگہ جگہ نظر سے گزرتا ہے۔

منشی نبی بخش حقیر علی گڈھ میں سررشتہ دار تھے۔ مولوی حالی نے لکھا ہے کہ "سخن فہمی سخن سنجی کی بڑے بڑے لوگوں سے تعریف سنی گئی ہے۔" ان سے غالب کے گہرے مخلصانہ تعلقات تھے۔ چنانچہ جب وہ دلی آئے تو مرزا ہی کے مکان پر قیام کیا۔ اس زمانہ میں انھوں نے اپنے شاگرد مرزا تفتہ کو ایک خط لکھا جس میں حقیر کی نسبت لکھتے ہیں:۔

"خدا نے میری بیکسی اور تنہائی پر رحم کیا اور ایسے شخص کو میرے پاس بھیجا جو میرے زخموں کا مرہم اور میرے درد کا درماں اپنے ساتھ لایا۔ اور جس نے میری اندھیری رات کو روشن کر دیا۔ اس نے اپنی باتوں سے ایک ایسی شمع روشن کی جس کی روشنی میں میں نے اپنے کلام کی خوبی جو تیرہ بختی کے اندھیرے میں خود میری نگاہ سے مخفی تھی، دیکھی۔ میں حیران ہوں کہ اس فرزانۂ یگانہ یعنی منشی نبی بخش کو کس درجے کی سخن فہمی و سخن سنجی عنایت ہوئی ہے۔ حالانکہ میں شعر کہتا ہوں اور شعر کہنا جانتا ہوں۔ مگر جب تک میں نے اس بزرگوار کو نہیں دیکھا یہ نہیں سمجھا کہ سخن فہمی کیا چیز ہے؟ اور سخن فہم کس کو کہتے ہیں؟ مشہور ہے کہ خدا نے حسن کے دو حصے کیے۔ آدھا یوسفؑ کو دیا اور آدھا تمام بنی نوع انسان کو۔ کچھ تعجب نہیں کہ فہم سخن اور ذوق معنیٰ کے بھی دو حصے کیے گئے ہوں اور آدھا منشی نبی بخش کے اور آدھا تمام دنیا کے حصہ میں آیا ہو۔ گو زمانہ اور آسمان میرا کیسا ہی مخالف ہو میں اس شخص کی دوستی کی بدولت زمانہ کی

دشمنی سے بے فکر ہوں اور اس نعمت پر دنیا سے قانع؟

ظاہر ہے کہ غالب کے دل میں حقیر کی کتنی عزت تھی۔ وہ ہر جگہ ان کو بھائی اور ان کے فرزند عبداللطیف کو بھتیجے کے رشتہ سے یاد کرتے تھے۔ جب انہوں نے اپنی کتاب دستنبو آگرہ میں چھپائی تو منشی نبی بخش ہی نے اس کی تصحیح وغیرہ کا ذمہ لیا۔ غالب کو ان پر بیحد اعتماد تھا اور ان دونوں کے آپس میں کوئی بیگانگی نہ تھی۔

تلامذہ

غالب کے تلامذہ کا حلقہ بھی نہایت وسیع تھا اور ان میں بھی ہر مذہب و ملت کے لوگ شامل تھے۔ ان کے سب سے چہیتے اور مشہور شاگرد مجروح تھے۔

میر مہدی حسین مجروح جو غالب کی دید کے مشتاق اور ان کے خطوط کے ہمہ تن منتظر رہتے تھے۔ غالب نے ان کو لکھا تھا کہ:-

"میر مہدی! جیتے رہو۔ آفرین صد ہزار آفریں۔ اردو عبارت کے لکھنے کا کیا اچھا ڈھنگ پیدا کیا ہے کہ مجھ کو رشک آنے لگا ہے سنو دلی کی تمام مال و متاع و زر و گوہر کی لوٹ پنجاب احاطہ میں گئی ہے۔ یہ طرز عبارت خاص میری دولت تھی سو ایک ظالم پانی پت انصاریوں کے محلہ کا رہنے والا لوٹ لے گیا۔ مگر میں نے اس کو بحل کیا۔ اللہ برکت دے۔"

میر مہدی غدر کے بعد کئی سال پانی پت میں مقیم رہے انصاریوں کے محلہ میں رہتے تھے اور وہیں سے مرزا سے مراسلت کرتے تھے۔ وہ نہ صرف شاعری بلکہ انشاپردازی میں بھی مرزا غالب کے سچے جانشین اور لائق شاگرد تھے۔ انھوں نے استاد کی وفات کا جو قطعہ تاریخ لکھا تھا وہ غالب کے سنگِ مزار پر کندہ ہے:-

کل میں غم و اندوہ میں با خاطر محزوں | تھا تربت استاد پہ بیٹھا ہوا غمناک
دیکھا جو مجھے فکر میں تاریخ کے مجروح | ہاتف نے کہا گنج معانی ہے تہ خاک

مرزا غالب کے بعض بہترین خطوط میر مہدی مجروح ہی کے نام لکھے گئے ہیں۔

منشی ہرگوپال تفتہ

یوں تو غالب کے متعدد ہند و تلامذہ قابلِ ذکر ہیں لیکن منشی ہرگوپال سے مرزا کو خاص تعلق رہا ہے۔ اور مرزا تفتہ انہی کا دیا ہوا خطاب آج تک اردو ادب میں مشہور ہے۔ مرزا غالب ان کو لکھتے ہیں :۔ "میں تم کو اپنے فرزند کی جگہ سمجھتا ہوں" ایک اور جگہ لکھا کہ "مجھ کو اس پر ناز ہے کہ میں ہندستان میں ایک دوست صادق الولا رکھتا ہوں جس کا ہرگوپال نام اور تفتہ تخلص ہے...... میرا حقیقی بھائی کل ایک تھا وہ تیس برس دیوانہ رہ کر مر گیا۔ مثلاً وہ جیتا ہوتا اور تمھاری برائی کرتا تو میں اس کو جھڑک دیتا اور اس سے آزردہ ہوتا۔

مرزا تفتہ بڑے صادق الولا اور اطاعت گزار شاگرد تھے۔ انھوں نے غالب کی تصنیفات کی طباعت و اشاعت میں ان کی بڑی مدد کی۔ غالب کو بھی ان پہ ناز تھا اور جو بھی کام ہوتا ان کے تفویض کر دیتے تھے۔ غالب کے اردو خطوط سب سے زیادہ انہی کے نام لکھے گئے ہیں۔